

# تفہیم القرآن

ظہ

(۲)

ان صفحات میں تفہیم القرآن کی اشاعت کا سلسلہ جون ۱۹۵۳ء کے بعد سے بند رہا ہے جس کے اسباب ناظرین کو خود ہی معلوم ہیں آخری قسط جو ماہ جون ۱۹۵۳ء کے پرچے میں شائع ہوئی تھی اس میں سورہ ظہ کے دوسرے رکوع تک سلسلہ پہنچ چکا تھا۔ آگے جیل کے زمانہ قیام میں جس قدر کام ہوا ہے اسے انشاء اللہ بڑی بڑی قسطوں میں شائع کر کے جلد ہی ناظرین تک پہنچا دیا جائے گا تاکہ کسی عذرتک اس تشنگی کی تلافی ہو سکے جو پچھلے ۲۵ مہینوں کے دوران میں محسوس کی جاتی رہی ہے۔ تمام ناظرین سے باعزم اور اہل علم حضرات سے بالخصوص گزارش ہے کہ ترجمانی و تفسیر میں جو غلطی، لغزش یا کوتاہی محسوس فرمائیں اس سے مجھے آگاہ فرمادیں تاکہ کتابی شکل میں محتاج ہونے سے پہلے اس کی اصلاح کر سکوں۔

ابوالاعلیٰ

فرعون نے کہا: "اچھا، تو پھر تم دونوں کا رب کون ہے اے موسیٰ؟"

نلہ یہاں قصے کی ان تفصیلات کو چھوڑ دیا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ کس طرح فرعون کے پاس پہنچے اور کس طرح اپنی دعوت اس کے سامنے پیش کی۔ یہ تفصیلات سورہ اعراف رکوع ۱۳ میں گزر چکی ہیں اور آگے سورہ شجرہ رکوع ۲-۳ سورہ قصص رکوع ۴، اور سورہ نازعات رکوع ۱ میں آنے والی ہیں۔

فرعون کے متعلق مزید معلومات کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم، صفحہ ۶۴-۶۵۔

نلہ دونوں بھائیوں میں سے اصل صاحب دعوت چونکہ موسیٰ علیہ السلام تھے اس لیے فرعون نے انہی کو نبی مقرر کیا۔

موسیٰ نے جواب دیا کہ ہمارا رب وہ ہے جس نے ہمیں چیز کو اس کی ساخت بخشی، پھر اس کو اور ہو سکتا ہے کہ خطاب کا رخ ان کی طرف رکھنے سے اس کا مقصد یہ بھی ہو کہ وہ حضرت ہارون کی فصاحت و بلاغت کو میدان میں آنے کا موقع نہ دینا چاہتا ہو اور حضرت موسیٰ کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہو جس کا ذکر اس سے پہلے گزر چکا ہے۔

فرعون کے اس سوال کا منشا یہ تھا کہ تم دونوں کسے رب بنا بیٹھے ہو۔ مصر اور اہل مصر کا رب تو میں ہوں۔ سو فرعون نے اس میں اس کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ "أَتَدْعُونِي إِلَىٰ مَا كُنْتُ آتِيهِمْ" اے اہل مصر تمہارا رب اعلیٰ میں ہوں۔ "سورہ زمر میں وہ بھرے وہ بار کو مخاطب کر کے کہتا ہے "يَقَوْمِ الْإِنْسِ لِي مُلْكٌ مِّمَّنْ وَهَذِهِ الْأَنْهَارُ تَجْرِي مِن تَحْتِي" قوم، کیا مصر کی بادشاہی میری نہیں ہے؟ اور یہ نہریں میرے نیچے نہیں بہ رہی ہیں؟ (رکوع ۵)۔ سورہ قصص میں وہ اپنے درباریوں کے سامنے یوں بکارتا ہے "يَا أَيُّهَا الْمَلَأَ مَا عَلِمْتُمْ لِي مِنْ إِيَّاهِ غَيْرِي، قَا وَقَدْ لِي يَا هَٰؤُلَاءِ عَلَىٰ الْبَطِينِ فَاَجْعَلْ لِي صُرْحًا لَعَلِّي أَطَّلِعَ إِلَىٰ إِلَهِ مُوسَىٰ" اے سرداران قوم، میں نہیں جانتا کہ میرے سوا تمہارا کوئی اور بھی الہ ہے، اسے ہانہ ذرا ایٹیں پورا اور ایک بلند عمارت میرے لیے تیار کر آنا کہ میں ذرا اوپر چڑھ کر دیکھوں تو سہی کہ یہ موسیٰ کسے الہ بنا رہا ہے" (رکوع ۴)۔ سورہ شعراء میں وہ حضرت موسیٰ کو ڈانٹ کر کہتا ہے "لَيْسَ اتَّخَذْتَ إِلَّا هَا غَيْرِي لِأَجْعَلَكَ مِنَ الْمَسْجُورِينَ" اگر تو نے میرے سوا کسی کو الہ بنا لیا تو بیاورہ کہ تجھے جیل بھیج دوں گا" (رکوع ۱۲)

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ فرعون اپنی قوم کا واحد معبود تھا اور وہاں اس کے سوا کسی کی پرستش نہ ہوتی تھی۔ یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ فرعون خود سورج و دینا (سورج یا ریح) کے اقوار کی حیثیت سے بادشاہی کا استحقاق جتنا تھا اور یہ بات بھی مصر کی تاریخ سے ثابت ہے کہ اس قوم کے مذہب میں بہت سے دیوتاؤں اور دیوبندوں کی عبادت ہوتی تھی۔ اس لیے فرعون کا دعویٰ "واحد مرکز پرستش" ہونے کا نہ تھا، بلکہ وہ عملاً مصر کی اور نظریے کے اعتبار سے دراصل پوری نوع انسانی کی سیاسی ریڈیٹ کا مدعی تھا اور یہ ماننے کے لیے تیار تھا کہ اس کے اوپر کوئی دوسری ہستی فرما تو رہا ہو جس کا نمائندہ اگر اسے ایک حکم دے اور اس حکم کی اطاعت کا مطالبہ اس سے کرے۔

بلکہ یعنی ہم ہر معنی میں صرف اس کو رب مانتے ہیں۔ پروردگار، آقا، مالک، حاکم، سب کچھ ہمارے نزدیک

راستہ بتایا۔

دی ہے۔ کسی معنی میں بھی اُس کے سوا کوئی دوسرا رب نہیں تسلیم نہیں ہے۔

اس لئے یعنی دنیا کی ہر شے جیسی کچھ بھی بنی ہوئی ہے، اسی کے بنانے سے بنی ہے۔ ہر چیز کو جو بناوٹ، جو شکل، جو ہوت، جو قوت و صلاحیت، اور جو صفت و خاصیت حاصل ہے۔ اسی کے عطیے اور بخشش کی بدولت حاصل ہے۔ ہاتھ کو دنیا میں اپنا کام کرنے کے لیے جس ساخت کی ضرورت تھی وہ اس کو دی، اور پاؤں کو جو مناسب ترین ساخت کا تھی وہ اس کو بخشی۔ انسان، حیوان، نباتات، جمادات، ہوا، پانی، روشنی، ہر ایک چیز کو اُس نے وہ صورت خاص عطا کی ہے جو اسے کائنات میں اپنے حصے کا کام ٹھیک ٹھیک انجام دینے کے لیے مطلوب ہے۔

پھر اس نے صرف یہی نہیں کیا کہ ہر چیز کو اس کی مخصوص بناوٹ دے کر یونہی چھوڑ دیا ہو۔ بلکہ اس کے بعد وہی ان سب چیزوں کی رہنمائی بھی کرتا ہے۔ دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جسے اپنی ساخت سے کام لینے اور اپنے مقصد تک پہنچنے کے لیے کوئی اور طریقہ اس نے نہ سکھایا ہو۔ کان کو سننا اور آنکھ کو دیکھنا اسی نے سکھایا ہے۔ مچھلی کو تیرنا اور چڑیا کو اڑنا اسی کی تعلیم سے آیا ہے۔ ورت کو چیل پھول دینے اور زمین کو نباتات اگانے کی ہدایت اسی نے دی ہے۔ غرض وہ ساری کائنات اور اس کی ہر چیز کا صرف خالق ہی نہیں، باری اور معتم بھی ہے۔

اس بے نظیر جامع و مختصر جملے میں حضرت موسیٰ نے صرف یہی نہیں بتایا کہ ان کا رب کون ہے۔ بلکہ یہ بھی بتا دیا کہ وہ کیوں رب ہے اور کس لیے اُس کے سوا کسی اور کو رب نہیں مانا جاسکتا۔ دعویٰ کے ساتھ اس کی دلیل بھی اسی چھوٹے سے فقرے میں اگئی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب یہ فرعون اور اس کی رعایا کا ہر فرد اپنے وجودِ خاص کے لیے اللہ کا ممنون احسان ہے، اور تب ان میں سے کوئی ایک لمحہ کے لیے زندہ تک نہیں رہ سکتا جب تک اس کا دل اور اس کے پیچھے اور اس کا وعدہ و جگر اللہ کی دی ہوئی ہدایت سے اپنا کام نہ کیے چلے جائیں، تو فرعون کا یہ دعویٰ کہ وہ لوگوں کا رب ہے، اور لوگوں کا یہ ماننا کہ وہ واقعی ان کا رب ہے، ایک حماقت اور ایک مذاق کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔

مزید براں، اسی خدا سے فقرے میں حضرت موسیٰ نے اشارتاً رسالت کی دلیل بھی پیش کر دی جس کے ماننے سے فرعون کو انکار تھا۔ ان کی دلیل میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ خدا جو تمام کائنات کا باری ہے، اور جو ہر چیز کو اس کی

فرعون بولا اور پہلے جو نسلیں گزر چکی ہیں ان کی پھر کیا حالت تھی؟

موسیٰ نے کہا "اس کا علم میرے رب کے پاس ایک نوشتے میں محفوظ رکھنا ہے۔ جو کہ ہے یہ فرعون کا ہے۔"

حالت اور ضرورت کے مطابق ہدایت دے رہا ہے اس کے عالمگیر منصب ہدایت کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ وہ انسان کی شعوری زندگی کے لیے بھی رہنمائی کا انتظام کرے، اور انسان کی شعوری زندگی کے لیے رہنمائی کی وہ عملی موزوں نہیں ہو سکتی جو مچھلی اور مرغی کی رہنمائی کے لیے موزوں ہے۔ اس کی موزوں ترین تشکل یہ ہے کہ ایک ذی شعور انسان اس کی طرف سے انسانوں کی ہدایت پر مامور ہو اور وہ ان کی عقل و شعور کو اپیل کر کے انہیں سیدھا راستہ بتائے۔

مکالمہ یعنی اگر بات یہی ہے کہ جس نے ہر چیز کو اس کی ساخت بخشی اور زندگی میں کام کرنے کا راستہ بتایا اس کے سوا کوئی دوسرا سب نہیں ہے، تو یہ ہم سب کے باپ داؤد صمد ہا برس سے نسل در نسل دوسرے ارباب کی بندگی کرتے چلے آ رہے ہیں، ان کی تمہارے نزدیک کیا پوزیشن ہے، کیا وہ سب عذاب کے مستحق تھے، کیا ان سب کی عقلیں مارنی گئی تھیں؟ یہ تھا فرعون کے پاس حضرت موسیٰ کی اس دلیل کا جواب نہ ہو سکتا ہے کہ یہ جواب انہیں نے بنا بنائے جہالت دیا ہو، اور ہو سکتا ہے کہ بنائے شرارت، اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس میں دونوں باتیں شامل ہوں یعنی وہ خود بھی اس بات پر بھٹلا گیا ہو کہ اس مذہب سے ہمارے تمام بزرگوں کی گمراہی لازم آتی ہے، اور ساتھ ساتھ اس کا مقصد یہ بھی ہو کہ اپنے اہل و بار اور عام اہل مصر کے دلوں میں حضرت موسیٰ کی دعوت کے خلاف ایک تعصب بھڑکائے۔ اہل حق کی تبلیغ کے خلاف یہ ہتھکنڈا ہمیشہ استعمال کیا جاتا رہا ہے اور جاہلوں کو مشتعل کرنے کے لیے بڑا موثر ثابت ہوا ہے۔ خصوصاً اس زمانہ میں جبکہ قرآن کی یہ آیات نازل ہوئی ہیں، مکہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو نیا دکھانے کے لیے سب سے زیادہ اسی ہتھکنڈے سے کام لیا جا رہا تھا۔ اس لیے حضرت موسیٰ کے مقابلے میں فرعون کی اس مکاری کا ذکر یہاں بالکل بر محل تھا۔

۵۷۷ یہ ایک نہایت ہی حکیمانہ جواب ہے جو حضرت موسیٰ نے اس وقت دیا اور اس سے حکمت تبلیغ کا ایک بہترین سبق حاصل ہوتا ہے۔ فرعون کا مقصد، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، سامعین کے، اور ان کے توسط سے پوری قوم کے دلوں میں تعصب کی آگ بھڑکانا تھا۔ اگر حضرت موسیٰ کہتے کہ ہاں وہ سب جاہل اور گمراہ تھے اور سب کے جہنم کا ایندھن بنیں گے تو چاہے یہ حق گوئی کا بڑا زبردست نمونہ ہوتا، مگر یہ جواب حضرت موسیٰ کے بجائے فرعون کے معتقد

— وہی جس نے تمہارے لیے زمین کا فرش کچھایا، اور اس میں تمہارے چلنے کو راستے بنائے، اور اوپر سے پانی برسایا، پھر اس کے ذریعہ سے مختلف اقسام کی پیداوار نکالی۔ کھاؤ اور اپنے جانوروں کو بھی پڑاؤ۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں عقل رکھنے والوں کے لیے۔ اسی زمین سے ہم نے تم کو پیدا کیا ہے، اسی میں ہم تمہیں واپس لے جائیں گے اور اسی سے تم کو دوبارہ نکالیں گے۔

کی زیادہ خدمت انجام دینا۔ اس لیے آنجناب نے کمال دانائی کے ساتھ ایسا جواب دیا جو بجائے خود حق بھی تھا، اور ساتھ ساتھ اس نے فرعون کے زبریلے دانت بھی توڑ دیے۔ آپ نے فرمایا کہ وہ لوگ جیسے کچھ بھی تھے، اپنا کام کئے خدا کے ہاں جا چکے ہیں۔ میرے پاس ان کے اعمال اور ان کی نیتوں کو جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ ان کے بارے میں کوئی حکم لگاؤں۔ ان کا پورا ریکارڈ اللہ کے پاس محفوظ ہے۔ ان کی ایک ایک حرکت اور اس کے محرکات کو خدا جانتا ہے۔ نہ خدا کی نگاہ سے کوئی چیز چھپی رہ گئی ہے اور نہ اس کے حافظہ سے کوئی شے محو ہوئی ہے۔ ان سے جو کچھ بھی معاملہ خدا کو کرنا ہے اس کو وہی جانتا ہے مجھے اور تمہیں یہ فکر نہیں ہونی چاہیے کہ ان کا موقف کیا تھا اور ان کا انجام کیا ہوگا۔ ہیں تو اس کی فکر ہونی چاہیے کہ ہمارا موقف کیا ہے اور ہمیں کس انجام سے دوچار ہونا ہے۔

۲۶ انداز کلام سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ کا جواب ”بھوتنا ہے“ پر ختم ہو گیا، اور یہاں سے آخر پیرا گرفت تک کی پوری عبارت اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور شرح و تذکیر ارشاد ہوئی ہے۔ قرآن میں اس طرح کی مثالیں بکثرت موجود ہیں کہ کسی گندے ہونے یا آئندہ پیش آنے والے واقعے کو بیان کرتے ہوئے جب کسی شخص کا کوئی قول نقل کیا جاتا ہے، تو اس کے بعد منضلاً چند فقرے وعظ و پند یا شرح و تفسیر یا تفصیل و توضیح کے طور پر مزید ارشاد فرمائے جاتے ہیں اور صرف انداز کلام سے پتہ چل جاتا ہے کہ یہ اس شخص کا قول نہیں ہے جس کا پہلے ذکر ہو رہا تھا، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا اپنا قول ہے۔

واضح ہے کہ اس عبارت کا تعلق صرف قریب کے فقرے ”میرا رب نہ چوکتا ہے نہ بھوتنا ہے“ سے ہی نہیں ہے بلکہ حضرت موسیٰ کے پورے کلام سے ہے جو ”وَلَمَّا آتَيْنَا آلَ فِرْعَوْنَ لَمَّا كَانُوا إِذٍ مُّسْتَمِعِينَ“ سے شروع ہوا ہے۔

۲۷ یعنی جو لوگ عقل سلیم سے کام لے کر جستجوئے حق کرنا چاہتے ہوں وہ ان نشانات کی مدد سے منزل حقیقت تک پہنچنے کا راستہ معلوم کر سکتے ہیں۔ یہ نشانات اس کو بتادیں گے کہ اس کا نشانہ کاشا کا ایک رب ہے اور ربوبیت ساری

ہم نے فرعون کو اپنی سب ہی نشانیاں دکھائیں مگر وہ جھٹلنے چلا گیا اور نہ مانا۔ کہنے لگا "اے  
موسیٰ، کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ اپنے جادو کے زور سے ہم کو ہمارے ملک سے نکال باہر کرے  
کی ساری اسی کی جیسے کسی دوسرے رب کے لیے یہاں کوئی گنجائش نہیں ہے۔"

یعنی ہر انسان کو لازماً تین مرحلوں سے گزرنا ہے۔ ایک مرحلہ موجودہ دنیا میں پیدائش سے لیکر موت تک کا۔ دوسرا  
مرحلہ موت۔ سے قیامت تک کا۔ اور تیسرا قیامت کے روز دوبارہ زندہ ہونے کے بعد کا مرحلہ۔ یہ تینوں مرحلے اس آیت  
کی رو سے اسی زمین پر گزرنے والے ہیں۔

لکھ یعنی آفاق و انفس کے دلائل کی نشانیاں بھی، اور وہ معجزات بھی جو حضرت موسیٰ کو دیے گئے تھے۔ قرآن میں منقود  
مقامات پر حضرت موسیٰ کی وہ تقریریں بھی موجود ہیں جو انہوں نے فرعون کو سمجھانے کے لیے کہیں۔ اور وہ معجزات بھی مذکور  
ہیں جو اس کو پے در پے دکھائے گئے۔

لکھ جادو سے مراد خدا اور پیر بیضا کا معجزہ ہے جو سورہ اعراف اور سورہ شعراء کی تفصیلات کے بموجب حضرت موسیٰ  
نے پہلی ہی ملاقات کے وقت بھرے دربار میں پیش کیا تھا۔ اس معجزے کو دیکھ کر فرعون پر جو بدحواسی طاری ہوئی اس کا اثر  
اس کے اسی فقرے سے کیا جا سکتا ہے کہ منلو اپنے جادو کے زور سے ہم کو ہمارے ملک سے نکال باہر کرنا چاہتا ہے۔  
دنیا کی تاریخ میں نہ پہلے کبھی یہ واقعہ پیش آیا تھا اور نہ بعد میں کبھی پیش آیا کہ کسی جادوگر نے اپنے جادو کے زور سے کوئی ملک  
تخیر کر لیا ہو۔ فرعون کے اپنے ملک میں سینکڑوں ہزاروں جادوگر موجود تھے جو تمنا سے دکھا دکھا کر انعام کے لیے ہاتھ پھیلاتے  
پھرتے تھے۔ اس لیے فرعون کا ایک طرف یہ کہنا کہ تو جادوگر ہے، اور دوسری طرف یہ خطرہ ظاہر کرنا کہ تو میری سلطنت  
چھین لینا چاہتا ہے، کھلی ہوئی بدحواسی کی علامت ہے۔ دراصل وہ حضرت موسیٰ کی معقول و مدلل تقریر، اور پھر ان کے  
معجزے کو دیکھ کر یہ سمجھ گیا تھا کہ نہ صرف اس کے اہل دربار، بلکہ اس کی رعایا کے بھی عوام و خواص اس سے متاثر ہونے لگے  
نہ رہ سکیں گے۔ اس لیے اس نے مجبوت اور فریب اور تعصبات کی انگلیت سے کام نکالنے کی کوشش شروع کر دی۔  
اس نے کہا کہ یہ معجزہ نہیں جادو ہے اور ہماری سلطنت کا ہر جادوگر اسی طرح لالچی کو سانپ بنا کر دکھاتا ہے اس  
نے کہا کہ لوگو، تم ادا کیجو۔ یہ تمہارے باپ، دادا کو گمراہ اور سبھی ٹھیکرتا ہے۔ اس نے کہا کہ لوگو

ہر شیاء ہو جادو، یہ معجزہ و غیر کچھ نہیں ہے، اقتدار کا بھوکا ہے، چاہتا ہے کہ

اچھا، ہم بھی تیرے مقابلے میں ویسا ہی جادو لاتے ہیں۔ طے کر لے کب اور کہاں مقابلہ کرنا ہے۔ نہ ہم اس قرار واد سے پھریں گے نہ تو پھر لو۔ کھلے میدان میں سامنے آ جاؤ۔  
 موسیٰ نے کہا ”جشن کا دن طے ہوا، اور دن چڑھے لوگ جمع ہوں گے۔“  
 فرعون نے پلٹ کر اپنے سارے ہتھکنڈے جمع کیے اور مقابلے میں آگیا۔

یوسف کے زمانے کی طرح پھر سنی اسرائیل یہاں حکمران ہو جائیں اور قبلی قوم سے سلطنت چھین لی جائے۔ ان ہتھکنڈوں سے وہ دعوتِ حق کو نچا دکھانا چاہتا تھا۔

مزید شہادت کے لیے تفہیم القرآن جلد دوم کے حسب ذیل مقامات ملاحظہ ہوں۔ صفحہ ۶۵ تا ۶۸ اور صفحہ ۲۴۰۔  
 اللہ فرعون کا مدعا یہ تھا کہ ایک دفعہ جادو گروں سے لاکھوں اور رسیوں کو سانپ بنا کر دکھا دوں تو موسیٰ کے بجزے کا جو اثر لوگوں کے دلوں پر ہوا ہے وہ دور ہو جائے گا۔ یہ حضرت موسیٰ کی منہ مانگی مراد تھی۔ انہوں نے فرمایا کہ الگ کوئی دن اور جگہ مقرر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ جشن کا دن قریب ہے جس میں تمام ملک کے لوگ دارالسلطنت میں جمع کر آتے ہیں۔ وہیں میلے کے میدان میں مقابلہ ہو جائے تاکہ ساری قوم دیکھ لے۔ اور وقت بھی دن کی پوری روشنی کا ہونا چاہیے تاکہ شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہ رہے۔

اللہ فرعون اور اس کے درباریوں کی نگاہ میں اس مقابلے کی اہمیت یہ تھی کہ وہ اس کے فیصلے پر اپنی قسمت کا فیصلہ متعلق سمجھ رہے تھے۔ تمام ملک میں آدمی دوڑا دیٹے گئے کہ جہاں جہاں کوئی ماہر جادو گر موجود ہو اسے لے آئیں۔ اسی طرح عوام کو بھی جمع کرنے کی خاص طور پر ترغیب دی گئی تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اکٹھے ہوں اور اپنی آنکھوں سے جادو کے کمالات دیکھ کر عصائے موسیٰ کے رعب سے محفوظ ہو جائیں۔ کھلم کھلا کہا جانے لگا کہ ہمارے دین کا انحصار اب جادو گروں

کے کتھ پر ہے۔ وہ جنتیں تو ہمارا دین نیچے گا، ورنہ موسیٰ کا دین چھا کر رہے گا۔ (ملاحظہ ہو سورہ شعراء، رکوع ۲)

اس مقام پر یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ مصر کے شاہی خاندان اور طبقہ اہرام کا مذہب عوام کے مذہب سے کافی مختلف تھا۔ دونوں کے دین اور مندر الگ الگ تھے، مذہبی مراسم بھی یکساں نہ تھے، اور زندگی بعد موت کے معاملہ میں بھی جس کو مصر میں بہت بڑی اہمیت حاصل تھی، دونوں کے عملی طریقے اور نظری انجام میں بہت بڑا امتیاز پایا جاتا تھا۔

دعا حضرت ہو TOYNBEE کی A STUDY OF HISTORY صفحہ ۳۱-۳۲۔ علاوہ بریں مصر میں اس سے پہلے

موسیٰ نے (عین موقع پر) گروہ مقابل کو مخاطب کر کے، کہا: "شامت کے مارو، نہ جھوٹی تھمتیں بازو  
 اللہ پر، ورنہ ایک سخت عذاب سے تمہارا ستیا ناس کر دے گا جھوٹ جس نے بھی گھرا وہ نامراد ہوا۔"  
 یہ سن کر ان کے درمیان اختلاف رائے ہو گیا اور وہ چپکے چپکے باہم مشورہ کرنے لگے۔ آخر کار کچھ لگوں  
 نے کہا کہ: "یہ دونوں تو محض جادو گر ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ اپنے جادو کے زور سے تم کو تمہاری زمین سے

جو مذہبی انقلابات رونما ہوئے تھے ان کی بدولت وہاں کی آبادی میں متعدد ایسے عناصر پیدا ہو چکے تھے جو ایک مشترکانہ  
 مذہب کی بنسبت ایک توحیدی مذہب کو ترجیح دیتے تھے یا دے سکتے تھے۔ مثلاً خود بنی اسرائیل اور ان کے ہم مذہب  
 لوگ آبادی کا کم از کم دس فی صدی حصہ تھے۔ اس کے علاوہ اس مذہبی انقلاب کو ابھی پورے ڈیڑھ سو برس بھی نہ گزے  
 تھے جو فرعون امینوفس یا اخاتون (۱۳۶۰ ق م) نے حکومت کے زور سے برپا کیا تھا، جس میں تمام  
 معبودوں کو ختم کر کے صرف ایک معبود آتون باقی رکھا گیا۔ اگرچہ اس انقلاب کو بعد میں حکومت ہی کے زور سے اٹھ  
 دیا گیا، مگر کچھ نہ کچھ تو اپنے اثرات وہ بھی چھوڑ گیا تھا۔ ان حالات کو نگاہ میں رکھا جائے تو فرعون کی وہ گھبراہٹ  
 اچھی طرح سمجھ میں آ جاتی ہے جو اس موقع پر اسے لاحق تھی۔

۱۳۶۰ء یہ خطاب علوم سے نہ تھا جنہیں ابھی حضرت موسیٰ کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا تھا کہ آیا وہ معجزہ دکھانے میں  
 یا جادو، بلکہ خطاب فرعون اور اس کے درباریوں سے تھا جو انہیں جادو گر قرار دے رہے تھے۔  
 ۱۳۶۱ء یعنی اس کے معجزے کو جادو اور اس کے پیغمبر کو ساحر کہنا نہ قرار دو۔

۱۳۶۲ء اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اپنے دلوں میں اپنی کمزوری کو خود محسوس کر رہے تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ حضرت  
 موسیٰ نے جو کچھ دکھایا ہے وہ جادو نہیں ہے۔ وہ پہلے ہی سے اس مقابلے میں ڈرتے اور سچکپاتے ہوئے آئے تھے،  
 اور جب عین موقع پر حضرت موسیٰ نے ان کو دیکھا کہ متنبہ کیا تو ان کا غم یکایک متنزل ہو گیا۔ ان کا اختلاف رائے  
 اسی امر میں ہوتا ہو گا کہ آیا اس بڑے نہوار کے موقع پر، جیکہ پورے ملک سے آئے ہوئے آدمی اکٹھے ہیں، کھلے  
 میدان اور دن کی پوری روشنی میں یہ مقابلہ کرنا ٹھیک ہے یا نہیں۔ اگر یہاں ہم شکست کھا گئے اور سب کے سامنے  
 جادو اور معجزے کا فرق کھل گیا تو پھر بات سنبھالنے نہ سنبھال سکے گی۔

۱۳۶۳ء اور یہ کہنے والے لازماً فرعون یا اس کے وہ سر پھرے لوگ ہونگے جو حضرت موسیٰ کی مخالفت میں ہر بلائی کھیل



بے دخل کر دیں اور تمہارے مثالی طریق زندگی کا خاتمہ کر دیں۔ اپنی ساری تدبیریں آج اکٹھی کر لو اور الیکا کر کے میدان میں آؤ۔ بس یہ سمجھ لو کہ آج جو غالب رہا وہی جیت گیا۔

جادوگر بولے: "موسیٰ، تم چھینکتے ہو یا ہم چھینکیں؟"

موسیٰ نے کہا: "نہیں، تم ہی چھینکو۔"

یلاک ان کی رسیاں اور ان کی لالٹھیاں ان کے جادو کے زور سے موسیٰ کو دوڑتی ہوئی محسوس ہونے لگیں، اور موسیٰ اپنے دل میں ڈر گیا۔ ہم نے کہا: "مت ڈرو، تو ہی غالب رہے گا۔ چھینک جو کچھ تیرے

جانے پر آمادہ تھے۔ جہانگیر اور معاملہ فہم لوگ قدم آگے بڑھانے ہوئے مجھک رہے ہونگے۔ اور یہ سر پھرے جو شیلے لوگ کہتے ہونگے کہ خواہ مخواہ کی دور اندیشیاں چھوڑو اور جی کڑا کر کے مقابلہ کر ڈالو۔"

۳۷ یعنی ان لوگوں کا دار و مدار دو باتوں پر تھا۔ ایک یہ کہ اگر جادوگر بھی موسیٰ کی طرح لالٹھیوں سے سانپ بنا کر دکھا دیں گے تو موسیٰ کا جادوگر ہونا مجمع عام میں ثابت ہو جائے گا۔ دوسرے یہ کہ وہ مذہبی اور سیاسی تعصب کی آگ بھڑکا کر حکمران طبقے کو اندھا جوش دلانا چاہتے تھے اور یہ خوف انہیں دلا رہے تھے کہ موسیٰ کا غالب آجانا تمہارے ہاتھوں سے ملک نکل جانے اور تمہارے مثالی ر (IDEAL) طریق زندگی کے ختم ہو جانے کا ہم معنی ہے۔

۳۸ یعنی ان کے مقابلے میں متحدہ محاذ پیش کرو۔ اگر اس وقت تمہارے درمیان آپس ہی میں پھوٹ پڑ گئی اور عین مقابلے کے وقت مجمع عام کے سامنے یہ بھگچا بھٹ اور سرگوشیاں ہونے لگیں تو ابھی ہوا اکھڑ جائے گی اور لوگ سمجھ لیں گے کہ تم خود اپنے حق پر ہونے کا یقین نہیں رکھتے، بلکہ دونوں میں چوریسے بڑے مقابلے پر آئے ہو۔

۳۹ یہ سچ کی تفصیل چھوڑ دی گئی کہ اس پر فرعون کی صفوں میں اعتماد بحال ہو گیا اور مقابلہ شروع کرنے کا فیصلہ کئے جادوگر مل کو احکام دے دیئے گئے کہ میدان میں اتر آئیں۔

۴۰ سہۃ اعراف میں بیان ہوا تھا کہ فلما انقوا سحر و اعیین الناس واسترہوہم، جب انہوں نے اپنے آنچل چھینکے تو لوگوں کی نگاہوں کو مسحور کر دیا اور انہیں دہشت زدہ کر دیا۔ در کوع ۱۴ یہاں بتایا جا رہا ہے کہ یہ اثر صرف عام لوگوں پر ہی نہیں ہوا تھا، خود حضرت موسیٰ بھی سحر کے اثر سے متاثر ہو گئے تھے۔ ان کی صرف آنکھوں ہی نے یہ محسوس نہیں کیا بلکہ ان کے خیال پر بھی یہ اثر پڑا کہ لالٹھیاں اور رسیاں سانپ بن کر دوڑ رہی ہیں۔

باتھیں ہے، ابھی ان کی ساری بناوٹی چیزوں کو نکلے جاتا ہے۔ یہ جو کچھ بنا کر لائے ہیں۔ تو جادوگر کا فریب ہے۔ اور جادوگر کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا، خواہ کسی شان سے وہ آئے۔ آخر کو یہی ہوا کہ سارے جادوگر کچھ میں گرا دیے گئے اور پکاراٹھے ”ان یٰٰہیم نے ہاروں اور موسیٰ نے رب کو“

اچھے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جو نبی حضرت موسیٰ کی زبان سے ”پھینکو“ کا لفظ نکلا، جادوگروں نے یلبارگی اپنی لائٹیاں امد میں ان کی طرف پھینک دیں اور چانک ان کو یہ نظر آیا کہ سینکڑوں سانپ دوڑتے ہوئے ان کی طرف پلے آرہے ہیں۔ اس منظر سے فوری طور پر اگر حضرت موسیٰ نے ایک دہشت اپنے اندر محسوس کی ہو تو یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ انسان بہر حال انسان ہی ہوتا ہے۔ خواہ پیغمبری کیوں نہ ہو۔ انسانیت کے تقاضے اس سے منکف نہیں ہو سکتے۔ علاوہ یہی یہ بھی ممکن ہے کہ اُس وقت حضرت موسیٰ کو یہ خوف لاحق ہوا ہو کہ معجزے سے اس قدر مشابہ منظر دیکھ کر عوام ضرور فتنے میں پڑ جائیں گے۔

اس مقام پر یہ بات لائق ذکر ہے کہ قرآن یہاں اس امر کی تصدیق کر رہا ہے کہ عام انسانوں کی طرح پیغمبر بھی جادو سے متاثر ہو سکتا ہے۔ اگرچہ جادوگر اس کی نبوت سلب کر لینے، یا اس کے اوپر نازل ہونے والی وحی میں خلل ڈال دینے، یا جادو کے اثر سے اُس کو گمراہ کر دینے کی طاقت نہیں رکھتا، لیکن فی الجملہ کچھ دیر کے لیے اُس کے قوی پر یک گونہ اثر ضرور ڈال سکتا ہے۔ اس سے اُن لوگوں کے خیال کی غلطی کھل جاتی ہے جو احادیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کا اثر ہونے کی روایات پڑھ کر نہ صرف ان روایات کی تکذیب کرتے ہیں بلکہ اس سے آگے بڑھ کر تمام حدیثوں کو ناقابل اعتبار ٹھیرانے لگتے ہیں۔

نکلا ہو سکتا ہے کہ معجزے سے جراثیم و بائیں ہوا تھا وہ اُن تمام لائٹھیوں اور رسیوں ہی کو نکل گیا ہو جو سانپ بنی نظر آ رہی تھیں لیکن جن الفاظ میں یہاں اور دوسرے مقامات پر قرآن میں اس واقعہ کو بیان کیا گیا ہے اُن سے بظاہر گمان ہی ہوتا ہے کہ اس نے لائٹھیوں اور رسیوں کو نہیں نکلا بلکہ اُس جادو کے اثر کو باطل کر دیا جس کی بدولت وہ سانپ بنی نظر آ رہی تھیں۔ سورہ اعراف اور شعراء میں الفاظ یہ ہیں تَنَقَّبَ مَا يَافِكُونُ۔ جو تھوٹ وہ بنا رہے تھے اُس وہ نکلے جا رہا تھا۔ اور یہاں الفاظ یہ ہیں کہ تَنَقَّبَ مَا سَعَوْا، وہ نکل جائے گا اُس چیز کو جو انہوں نے بنا رکھی ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ ان کا تھوٹ اور ان کی بناوٹ لائٹھیاں اور رسیاں تھیں بلکہ وہ جادو تھا جس کی بدولت وہ سانپ

فرعون نے کہا: تم ایمان سے آئے قبل اس کے کہ میں تمہیں اس کی اجازت دیتا؛ معلوم ہو گیا کہ یہ تمہارا  
بنی نظر آ رہی تھیں۔ اس لیے ہزار خیمیاں یہ ہے کہ جدھر بدھردہ گیا لاطھیوں اور رسیوں کو لنگر کر اس طرح پھینکتا چلا  
گیا کہ ہر لاطھی، لاطھی اور برسی، رسی بن کر پڑی رہ گئی۔

۱۳۳۳ یعنی جب انہوں نے عصائے موسیٰ کا کارنامہ دیکھا تو انہیں فوراً یقین آ گیا کہ یہ یقیناً معجزہ ہے، ان کے من  
کی چیز سرگز نہیں ہے، اس لیے وہ اس طرح ایک بارگی اور بے ساختہ سجدے میں گرے جیسے کسی نے اٹھا اٹھا کر ان کو  
گرا دیا ہو۔

۱۳۳۴ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہاں سب کو معلوم تھا کہ یہ مقابلہ کس بنیاد پر ہو رہا ہے۔ پورے مجمع میں کوئی بھی اس  
غلط فہمی میں نہ تھا کہ مقابلہ موسیٰ اور جادوگروں کے کرتب کا ہو رہا ہے اور فیصلہ اس بات کا ہونا ہے کہ کس کا کرتب  
زبردست ہے۔ سب یہ جانتے تھے کہ ایک طرف موسیٰ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ، خالق زمین و آسمان کے پیغمبر کی  
حقیقت سے پیش کر رہے ہیں، اور اپنی پیغمبری کے ثبوت میں یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ ان کا عصا معجزے کے طور پر  
فی الواقع اُتر دیا جا رہا ہے۔ اور دوسری طرف جادوگروں کو بربر عام بلا کر فرعون یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ عصا سے اُتر دیا  
بن جانا معجزہ نہیں ہے بلکہ محض جادو کا کرتب ہے۔ بالفاظ دیگر، وہاں فرعون اور جادوگر اور سارے تماثلی عوام و خواص  
معجزے اور جادو کے فرق سے واقف تھے، اور امتحان اس بات کا ہو رہا تھا کہ موسیٰ جو کچھ دکھا رہے ہیں یہ جادو کی  
قسم سے ہے یا اس معجزے کی قسم سے جو رب العالمین کی قدرت کے کرشمے کے سوا اور کسی طاقت سے نہیں دکھایا  
جاسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ جادوگروں نے اپنے جادو کو مغایب ہوتے دیکھ کر یہ نہیں کہا کہ تم نے مان دیا، موسیٰ ہم سے زیادہ  
بالکمال ہے، بلکہ انہیں فوراً یقین آ گیا کہ موسیٰ واقعی رب العالمین کے سچے پیغمبر ہیں اور وہ پکاراٹھے کہ ہم اس خدا کو مان  
گئے جس کے پیغمبر کی حقیقت سے موسیٰ اور ہارون آئے ہیں۔

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مجمع عالم پر اس شکست کے کیا اثرات پڑے ہونگے۔ اور پھر پورے ملک پر اس کا  
کتنا زبردست اثر ہوا ہوگا۔ فرعون نے ملک کے سب سے بڑے مرکزی میسے میں یہ مقابلہ اس امید پر کیا تھا کہ جب  
مصر کے ہر گوشے سے آئے ہوئے لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ جائیں گے کہ لاطھی سے سانپ بنا دینا موسیٰ کا کوئی نزاع  
کمال نہیں ہے، ہر جادوگر یہ کرتب دکھالیتا ہے، تو موسیٰ کی ہوا اکھڑ جائیگی۔ لیکن اس کی بے تدبیر سی پرانسی پڑی، اور

گروہ ہے جس نے تمہیں جادوگری سکھائی تھی۔ اچھا، اب میں تمہارے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کٹواتا ہوں اور کھجور کے تنوں پر تم کو سولی دیتا ہوں۔ پھر تمہیں تپ چل جائے گا کہ ہم دونوں میں سے کس کا عذاب زیادہ سخت اور دیر پا ہے؟

قریب قریب سے آئے ہوئے لوگوں کے سامنے خود جادو گروں ہی نے باہم اتفاق اس بات کی تصدیق کر دی کہ موسیٰ جو کچھ دکھا رہے ہیں یہ ان کے فن کی چیز نہیں ہے، یہ فی الواقع معجزہ ہے جو صرف خدا کا پیغمبر ہی دکھا سکتا ہے۔

۵۷ سورہ اعراف میں الفاظ یہ ہیں اِنَّ هٰذَا الْمَكْرُ مُكْرٌ مَّعْمُوْمٌ فِی الْمَدِیْنَةِ لِنُخْرِجُوْا مِنْهَا اَهْلَهَا، یہ ایک سازش ہے جو تم لوگوں نے دارالسلطنت میں ملی بھگت کو کے کی ہے تاکہ سلطنت سے اس کے مالکوں کو بے دخل کر دوں۔ یہاں اس عمل کی تفصیل یہ دی گئی ہے کہ تمہارے درمیان صرف ملی بھگت ہی نہیں ہے، بلکہ معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہ موسیٰ تمہارا سردار اور گروہ ہے، تم نے معجزے سے شکست نہیں کھائی، بلکہ اپنے استاد سے جادو میں شکست کھائی ہے، اور تم آپس میں یہ طے کر کے آئے ہو کہ اپنے استاد کا غلبہ ثابت کر کے، اور اسے اس کی پیغمبری کا ثبوت بنا کر یہاں سیاہی انقلاب برپا کر دو۔

۵۸ یعنی ایک طرف کا ہاتھ اور دوسری طرف کا پاؤں۔

۵۹ صلیب یا سولی دینے کا قدیم طریقہ یہ تھا کہ ایک لمبا تھتیر سا لے کر زمین میں گاڑ دیتے تھے، یا کسی پرانے درخت کا تنہا اس غرض کے لیے استعمال کرتے تھے، اور اس کے اوپر کے سرے پر ایک تختہ آڑا کر کے باندھ دیتے تھے پھر مجرم کو اوپر چڑھا کر اور اس کے دونوں ہاتھ پھیلا کر اڑے تختے کے ساتھ کیلیں لٹھونک دیتے تھے۔ اس طرح مجرم تختے کے بل ٹسکارہ جاتا تھا اور گھنٹوں سسک سسک کر جان دے دیتا تھا۔ صلیب دیے ہوتے یہ مجرم ایک مدت تک رہتا تھا، مرنے دینے جاتے تھے تاکہ لوگ انہیں دیکھ دیکھ کر سبق حاصل کریں۔

۶۰ یہ بری ہوئی بازی حیرت لینے کے لیے فرعون کا آخری داؤں تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جادو گروں کو انتہائی خوفناک سزا سے ڈدا کر ان سے یہ اقبال کرا لے کہ واقعی یہ ان کی اور موسیٰ علیہ السلام کی ملی بھگت تھی اور وہ ان سے مل کر سلطنت کے خلاف سازش کر چکے تھے مگر جادو گروں کے غم و استغامت نے اس کا یہ داؤں بھی الٹ دیا۔ انہوں نے اتنی ہوشیاری سزا برداشت کرنے کے لیے تیار ہو کر دنیا بھر کو یہ یقین دلا دیا کہ سازش کا الزام محض گڑھی ہوئی بات بنانے کے لیے

جادوگروں نے جواب دیا "قسم ہے اُس ذات کی جس نے ہمیں پیدا کیا ہے، یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ہم روشن نشانیاں سامنے آجانے کے بعد بھی (صداقت پر) تجھے تزییح دیں۔" لکھے تزییح دیں تو زیادہ سے زیادہ بس اسی دنیا کی زندگی کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ ہم تو اپنے رب پر ایمان لے آئے، تاکہ وہ ہماری خطائیں معاف کر دے اور اس جادوگری سے جس پر تو نے ہمیں مجبور کیا تھا، درگزر فرمائے۔ اللہ ہی اچھا ہے اور وہی باقی رہنے والا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو مجرم بن کر اپنے رب کے حضور حاضر ہوگا اُس کے لیے جہنم ہے جس میں وہ نہ بیچے گا نہ مرے گا۔ اور جو اس کے حضور مومن کی حیثیت سے حاضر ہوگا، جس نے نیک عمل کیے ہونگے، ایسے سب لوگوں کے لیے بلند درجے ہیں، سدا بہار باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہونگی، ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ جزا ہے اُس شخص کی جو پاکیزگی اختیار کرے۔ ہم نے موسیٰ پر وحی کی کہ اب راتوں رات میرے بندوں کو لے کر چل پڑ، اور ان کے لیے سمندر میں سے سوکھی لٹک بنا لے، تجھے کسی کے تعاقب کا ذرا خوف نہ ہو اور نہ (سمندر کے بیچ سے گذرتے ہوئے)

ایک بے شرانہ سیاسی چال کے طور پر گھڑا گیا ہے، اور اصل حقیقت یہی ہے کہ وہ سچے دل سے موسیٰ علیہ السلام کی نبوت پر ایمان لائے ہیں۔

۹ لکھ دوسرا ترجمہ اس آیت کا یہ بھی ہو سکتا ہے: "یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ہم ان روشن نشانیوں کے مقابلے میں جو ہمارے سامنے آچکی ہیں، اور اُس ذات کے مقابلے میں جس نے ہمیں پیدا کیا ہے، لکھے تزییح دیں۔" لکھے یہ جادوگروں کے قول پر اللہ تعالیٰ کا اپنا اعجاز ہے۔ انداز کلام خود تبارہا سے کہ یہ عبارت جادوگروں کے قول کا حصہ نہیں ہے۔

۱۰ یعنی موت اور زندگی کے درمیان ٹکٹا رہے گا۔ نہ موت آنے لگی کہ اس کی تکلیف اور مصیبت کا خاتمہ کر دے اور نہ جینے کا ہی کوئی لطف۔ بسے حاصل ہوگا کہ زندگی کو موت پر تزییح دے سکے۔ زندگی سے بیزار ہوگا، مگر موت نصیب نہ ہوگی۔ مزا چاہے گا مگر نہ سکے گا۔ قرآن مجید میں دوزخ کے خدا بوں کی جتنی تفصیلات دی گئی ہیں ان میں سب سے زیادہ خوفناک صورت عذاب یہی ہے جس کے تصور سے روح کانپ اٹھتی ہے۔

۱۱ بیچ میں ان حالات کی تفصیل چھوڑ دی گئی ہے جو اس کے بعد مصر کے طویل زمانہ قیام میں پیش آئے ان تفصیلات

ڈر لگے۔

پہچے سے فرعون اپنا لشکر لے کر پہنچا اور پھر سمندر ان پر چھا گیا جیسا کہ چھا جانے کا حق تھا۔ فرعون

کے لیے ملاحظہ ہو سورہ اعراف رکوع ۱۵-۱۶، سورہ یونس رکوع ۹۔ سورہ مومن رکوع ۳ تا ۵۔ اور سورہ زخرف رکوع ۳۷۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آخر کار ایک رات مقرر فرمادی جس میں تمام اسرائیلی وغیر اسرائیلی مسلمانوں کو (جن کے لیے "میرے بندوں" کا جامع لفظ استعمال کیا گیا ہے) مصر کے ہر حصے سے ہجرت کے لیے نکل پڑنا تھا یہ سب لوگ ایک طے شدہ مقام پر جمع ہو کر ایک قافلے کی صورت میں روانہ ہو گئے۔ اُس زمانے میں ہر سویر موجود نہ تھی۔ بحر احمر سے بحر روم (مڈیٹیرینین) تک کا پورا علاقہ کھلا ہوا تھا۔ مگر اس علاقے کے تمام راستوں پر فوجی چھاؤنیاں تھیں جن سے ہجرت نہیں گزرا جاسکتا تھا۔ اس لیے حضرت موسیٰ نے بحر احمر کی طرف جانے والا راستہ اختیار کیا غائبان کا خیال یہ تھا کہ سمندر کے کنارے کنارے چل کر جزیرہ نمائے سینا کی طرف نکل جائیں۔ لیکن اُدھر سے فرعون ایک لشکر عظیم لے کر تعاقب کرتا ہوا لھیک اس موقع پر پہنچا جبکہ یہ قافلہ ابھی سمندر کے ساحل ہی پر تھا۔ سورہ شعراء میں بیان ہوا ہے کہ ہاجرین کا قافلہ لشکر فرعون اور سمندر کے درمیان بالکل گھر چکا تھا۔ عین اس وقت اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو حکم دیا کہ اِضْرِبْ بِعَصَاكَ الْيَمْحُ: اپنا عصا سمندر پر مارنا۔ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيمِ: فوراً سمندر بچھٹ گیا اور اُس کا ہر ٹکڑا ایک بڑے ٹیلے کی طرح کھڑا ہو گیا۔ اور بیچ میں صرف یہی نہیں کہ قافلے کے گزرنے کے لیے راستہ نکل آیا، بلکہ بیچ کا یہ حصہ: اوپر کی آیت کے مطابق، خشک ہو کر سوکھی ٹرک کی طرح بن گیا۔ یہ صاف اور صریح معجزے کا بیان ہے اور اس سے اُن لوگوں کے بیان کی غلطی واضح ہو جاتی ہے جو کہتے ہیں کہ ہوا کے طوفان یا جوار بھاٹے کی وجہ سے سمندر بھٹ گیا تھا۔ اس طرح جو پانی بھٹتا ہے وہ دونوں طرف یلوں کی صورت میں کھڑا نہیں ہو جاتا۔ اور بیچ کا حصہ سوکھ کر ٹرک کی طرح نہیں بن جاتا۔

۳۷ سورہ شعراء میں بیان ہوا ہے کہ ہاجرین کے گزرنے ہی فرعون اپنے لشکر سمیت سمندر کے اس درمیانی راستے میں اتر آیا (رکوع ۴)۔ یہاں بیان کیا گیا ہے کہ سمندر نے اس کو اور اس کے لشکر کو دبوچ لیا۔ سورہ بقرہ میں ارشاد ہوا ہے کہ بنی اسرائیل سمندر کے دو کمرے اتارے پر سے فرعون اور اس کے لشکر کو غرق ہوتے ہوئے دیکھ رہے تھے (رکوع ۶)۔ اور سورہ یونس میں بتایا گیا ہے کہ ڈوبتے وقت فرعون پکارا تھا اَمْنْتُ اَشِدَّ اِلَّا الْمَدِي

نہ اپنی قوم کو گمراہ ہی کیا تھا، کوئی صحیح رہنمائی نہیں کی تھی۔

‘اٰمَنْتَ بِمِ بَنُوۡرَۤا سْرٰۤاۤیۡلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیۡنَ،’ میں مان گیا کہ کوئی خدا نہیں ہے اُس خدا کے سوا جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں، اور میں بھی مسلمانوں میں سے ہوں۔ مگر اس آخری لمحہ کے ایمان کو قبول نہ کیا گیا اور جواب ملا اَللّٰهُنَّ وَقَدْ عَصٰیۡتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِیۡنَ، فَاۤیۡوَمَ نُنۡجِیۡكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوۡنَ لِمَنْ خَلَقَكَ اٰیۡةً، ’’ اب ایمان لاتا ہے؛ اور پہلے یہ حال تھا کہ نافرمانی کرتا رہا اور فساد کیسے چلا گیا۔ اچھا، آج ہم تیری لاش کو پھلٹے پھلٹے ہیں تاکہ تو بعد کی نسلوں کے لیے نشانِ عبرت بنا رہے۔‘ (رکوع ۹)

۵۵ بڑے لطیف انداز میں کفار مکہ کو منہ دیا جا رہا ہے کہ تمہارے سردار اور لیڈر بھی تم کو اسی راستے پر لیے جا رہے ہیں جس پر فرعون اپنی قوم کو لے جا رہا تھا۔ اب تم خود دیکھ لو کہ یہ کوئی صحیح رہنمائی تو نہ تھی۔

اس قصے کے خاتمے پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بائبل کے بیانات کا بھی جائزہ لے لیا جائے تاکہ اُن لوگوں کے بھوٹ کی حقیقت کھل جائے جو کہتے ہیں کہ قرآن میں یہ قصے بنی اسرائیل سے نقل کر لیے گئے ہیں۔ بائبل کی کتاب خروج (EXODUS) میں اس قصے کی جو تفصیلات بیان ہوئی ہیں، ان کے حسب ذیل اجزاء قابلِ توجہ ہیں:-

(۱) باب ۴، آیت ۲-۵ میں بتایا گیا ہے کہ عصا کا معجزہ حضرت موسیٰ کو دیا گیا تھا۔ اور آیت ۷ میں انہی کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ ’’تو اس لاٹھی کو اپنے ہاتھ میں لیے جا اور اسی سے ان معجزوں کو دکھانا‘‘ مگر آگے جا کر یہ معلوم یہ لاٹھی کس طرح حضرت ہارون کے قبضے میں چلی گئی اور وہی اس سے معجزے دکھانے لگے۔ باب ۷ سے لے کر بعد کے ابواب میں مسلسل ہم کو حضرت ہارون ہی لاٹھی کے معجزے دکھاتے نظر آتے ہیں۔

(۲) باب ۵ میں فرعون سے حضرت موسیٰ کی پہلی ملاقات کا حال بیان کیا گیا ہے، اور اس میں سرے سے اُس بحث کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی ربوبیت کے مسئلے پر اُن کے اور فرعون کے درمیان ہوئی تھی فرعون کہتا ہے کہ ’’خداوند کون ہے کہ میں اُس کی بات مانوں اور بنی اسرائیل کو جانے دوں؟ میں خداوند کو نہیں جانتا‘‘ مگر حضرت موسیٰ اور ہارون اس کے سوا کچھ جواب نہیں دیتے کہ ’’عبرانیوں کا خدا ہم سے ملا ہے‘‘ (باب ۷ آیت ۲)۔

(۳) جاود گروں سے متعلق کی پوری داستان بس ان چند فقروں میں سمیٹ دی گئی ہے:-

’’اور خداوند نے موسیٰ اور ہارون سے کہا کہ جب فرعون تم کو کہے کہ اپنا معجزہ دکھاؤ تو ہارون سے کہتا

کہ اپنی لاطھی کو لیکر فرعون کے سامنے ڈال دے تاکہ وہ سانپ بن جائے۔ اور موسیٰ اور ہارون فرعون کے پاس گئے اور انہوں نے خداوند کے حکم کے مطابق کیا اور ہارون نے اپنی لاطھی فرعون اور اس کے خادموں کے سامنے ڈال دی اور وہ سانپ بن گئی۔ تب فرعون نے بھی داناؤں اور جادوگروں کو بلوایا اور مصر کے جادوگروں نے بھی اپنے جادو سے ایسا ہی کیا۔ کیونکہ انہوں نے بھی اپنی اپنی لاطھی سامنے ڈالی اور وہ نسا بن گئیں۔ لیکن ہارون کی لاطھی ان کی لاطھیوں کو نکل گئی۔“ (باب ۷۔ آیت ۸-۱۲)

اس بیان کا مقابلہ قرآن کے بیان سے کر کے دیکھ لیا جائے کہ قصے کی ساری روح یہاں کس بری طرح قفا کی گئی ہے۔ سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ جشن کے دن کھلے میدان میں باقاعدہ سلیج کے بعد مقابلہ ہونا، اولد پھر شکست کے بعد جادوگروں کا ایمان لانا، جو قصے کی اصل جان تھا، سرے سے یہاں مذکور ہی نہیں ہے۔

(۴) قرآن کہتا ہے کہ حضرت موسیٰ کا مطالبہ بنی اسرائیل کی رہائی اور آزادی کا تھا۔ بائبل کا بیان ہے کہ مطالبہ صرف یہ تھا کہ ہم کو اجازت دے کہ ہم تین دن کی منزل بیا بان میں جا کر خداوند اپنے خدا کے لیے قربانی کریں (آیت ۳)

(۵) مصر سے نکلنے اور فرعون کے غرق ہونے کا مفصل حال باب ۱۱ سے ۱۴ تک بیان کیا گیا ہے۔ اس میں بہت سی مفید معلومات، اور قرآن کے اجمال کی تفصیلات بھی ہیں مٹی میں اور ان کے ساتھ متعدد عجیب باتیں بھی۔ مثلاً باب ۱۴ کی آیات ۱۵-۱۶ میں حضرت موسیٰ کو حکم دیا جاتا ہے کہ تو اپنی لاطھی (جی ہاں۔ اب لاطھی حضرت ہارون سے لیکر پھر حضرت موسیٰ کو دے دی گئی ہے) اٹھا کر اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھا اور اسے دو حصے کر اور بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں سے خشک زمین پر چل کر نکل جائیں گے۔ لیکن آگے چل کر آیت ۲۱-۲۲ میں کہا جاتا ہے کہ پھر موسیٰ نے اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھا یا اور خداوند نے رات بھر تند لہریں آندھی چلا کر اور سمندر کو پیچھے ہٹا کر اسے خشک زمین بنا دیا اور پانی دو حصے ہو گیا اور بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں سے خشک زمین پر چل کر نکل گئے اور ان کے واسطے اور بائیں ہاتھ پانی دیوار کی طرح تھا۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ آیا یہ معجزہ تھا یا طبعی واقعہ؟ اگر معجزہ تھا تو عصا کی ضرب سے ہی رونما ہو گیا ہو گا، جیسا کہ قرآن میں کہا گیا ہے۔ اور اگر طبعی واقعہ تھا تو یہ عجیب صورت ہے کہ مشرقی آندھی نے سمندر کو بیچ میں سے پھاڑ کر پانی کو دونوں طرف دیوار کی طرح کھرا کر دیا اور بیچ میں سے



اسے بنی اسرائیل، ہم نے تم کو تمہارے دشمن سے نجات دی، اور طور کے دائیں جانب تہاری حاضری کے لیے وقت مقرر کیا، اہم قدم پر من و سلویٰ اُتارنا۔ کھاؤ سہارا دیا ہو، پاک رزق اور اسے کھا کر

شک راستہ بنا دیا۔ کیا فطری طریقے سے ہوا کبھی ایسے کوششے دکھاتی ہے؟

طور کا بیان نسبتاً بائبل سے مختلف اور قرآن سے قریب تر ہے، مگر دونوں کا مقابلہ کرنے سے صاف محسوس ہو جاتا ہے کہ ایک جگہ براہ راست علم وحی کی بنا پر واقعات بیان کیے جا رہے ہیں، اور دوسری جگہ صدیوں کی سیدہ بیستہ

روایات میں واقعات کی صورت اچھی خاصی مسخ ہو گئی ہے۔ ملاحظہ ہو: THE TALMUD SELECTIONS: H. POLANO, PP. 150-54.

۱۶۷ مندر کو عبور کرنے سے بیکر کوہ سینا کے دامن میں پہنچنے تک کی داستان بیچ میں چھوڑ دی گئی ہے۔ اس کی تفصیلات سورہ اعراف رکوع ۱۶-۱۷ میں گزر چکی ہیں۔ اور وہاں یہ بھی گزر چکا ہے کہ مصر سے نکلنے ہی بنی اسرائیل جزیرہ نمائے سینا کے ایک مندر کو دیکھ کر اپنے لیے ایک نادانی خدا مانگ بیٹھے تھے۔ (تفسیر سہیم القرآن جلد ۴۴ صفحہ ۷۵)۔

۷۵ یعنی طور کے مشرقی دامن میں۔

۷۵ سورہ بقرہ رکوع ۶۰ اور سورہ اعراف رکوع ۷۰ میں بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو شریعت کا ہدایت نامہ عطا کرنے کے لیے چالیس دن کی میعاد مقرر کی تھی جس کے بعد حضرت موسیٰ کو پتھر کی تختیوں پر لکھے ہوئے احکام عطا کیے گئے۔

۹۵ من و سلویٰ کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن جلد اول صفحہ ۷۷ اور جلد دوم صفحہ ۸۸۔ بائبل کا بیان ہے کہ مصر سے نکلنے کے بعد جب بنی اسرائیل دشمن سین میں ایلم اور سینا کے درمیان گزر رہے تھے اور خوراک کے ذخیرے ختم ہو کر قاتوں کی ذریت آگئی تھی، اُس وقت من و سلویٰ کا نزول شروع ہوا، اور فلسطین کے آباد علاقے میں پہنچنے تک پورے چالیس سال یہ سلسلہ جاری رہا (خروج باب ۱۶۔ گنتی باب ۱۱، آیت ۷-۹۔ یثوع: باب ۵، آیت ۱۲)۔ کتاب خروج میں من و سلویٰ کی یہ کیفیت بیان کی گئی ہے:-

۷۵ اور ایوں ہوا کہ شام کو اتنی ٹہیریں آئیں کہ اہل کی خمیہ گاہ کو ڈھانک لیا اور صبح کو خمیہ گاہ کے آس پاس

اوس ٹہری ہوئی تھی اور جب وہ اہل جو ٹہری تھی سوکھ گئی تو نیا دیکھتے ہیں کہ بیابان میں ایک چھوٹی چھوٹی

سرسخی نہ کرو۔ ورنہ تم پر میرا غضب ٹوٹ پڑے گا، اور جس پر میرا غضب ٹوٹا وہ پھر گر کر ہی رہا۔ العبتہ جو توبہ کرے اور ایمان لائے اور نیک عمل کرے، پھر سیدھا چلتا رہے، اس کے لیے میں بہت درگزر کرنے والا ہوں۔

”اور کیا چیز تمہیں اپنی قوم سے پہلے لے آئی موسیٰ؟“

”اُس نے عرض کیا ”وہ بس میرے پیچھے آہی رہے ہیں۔ میں جلدی کر کے تیرے حضور آ گیا ہوں، اے میرے رب، تاکہ تو مجھ سے خوش ہو جائے۔“

گول گول پیز ایسی چھوٹی جیسے پالے کے دانے ہوتے ہیں، زمین پر پڑی ہے۔ بنی اسرائیل اُسے دیکھ کر آپس میں کہنے لگے ”موت؟ کیونکہ وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ کیا ہے“ (باب ۱۶- آیت ۱۳-۱۵)

”اور بنی اسرائیل نے اُس کا نام صن رکھا اور وہ دھینے کے بیج کی طرح مفید اور اُس کا مزہ شہد کے بنے ہوئے پوسٹے کی طرح تھا“ (آیت ۳۱)

گنتی میں اس کی مزید شرح یہ ملتی ہے:-

”لوگ ادھر ادھر جا کر اسے جمع کرتے اور اسے چوہی میں پیتے یا اودھلی میں کوٹ پیتے تھے۔ پھر اسے ہانڈیوں میں اباں کر مٹیوں بناتے تھے۔ اس کا مزہ تازہ تیل کا سا تھا۔ اور رات کو جب لشکر کا، میں اوس پڑتی تو اس کے ساتھ من بھی گرتا تھا“ (باب ۱۱- آیت ۸-۹)

یہ بھی ایک معجزہ تھا۔ کیونکہ ۴۰ برس بعد جب بنی اسرائیل کے لیے خود اک کے فطری ذرائع بہم پہنچ گئے تو یہ سلسلہ بند کر دیا گیا۔ اب نہ اس علاقے میں ٹیڑوں کی وہ کثرت ہے، نہ من ہی کہیں پایا جاتا ہے تلاش و جستجو کرنے والوں نے اُن علاقوں کو چھان مارا ہے جہاں بائبل کے بیان کے مطابق بنی اسرائیل نے ۴۰ سال تک وشتت خوردی کی تھی۔ من اُن کو کہیں نہ ملا۔ العبتہ کاروباری لوگ خریداروں کو بے وقوف بنانے کے لیے من کا حلوہ ضرور بیچتے پھرتے ہیں۔

نلہ یعنی مغفرت کے لیے چاہیے ہیں۔ اول، توبہ یعنی سرکشی و نافرمانی یا شرک و کفر سے باز آ جانا۔ دوم، اے ابن یعنی اللہ اور رسول اور کتاب، اے آخرت کو صدق دل سے مان لینا۔ تیسرے، عمل صالح یعنی اللہ اور رسول کی ہدایات کے مطابق نیک عمل کرنا۔ چوتھے (امداد، یعنی راہ راستہ پر ثابت قدم رہنا اور پھر غلط راستے پر نہ جا پڑنا۔

فرمایا اچھا، تو سنو، ہم نے تمہارے پیچھے مہاری قوم کو آناش میں ڈال دیا اور سامری نے انہیں  
گمراہ کر ڈالا۔

۱۱۹ پہلے سے سلسلہ بیان اُس واقعہ کے ساتھ جڑتا ہے جو ابھی اوپر بیان ہوا ہے۔ یعنی بنی اسرائیل سے یہ  
وعدہ کیا گیا تھا کہ تم طور کے وادیں جانب ٹھہرو۔ اور چالیس دن کی مدت گزرنے پر تمہیں ہدایت نامہ عطا کیا جائیگا۔  
۱۲۰ اس فقرے سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم کو راستے ہی میں چھوڑ کر حضرت موسیٰ اپنے رب کی ملاقات کے  
شوق میں آگے چلے گئے تھے۔ طور کی جانب امین میں، جہاں کا وادہ بنی اسرائیل سے لیا گیا تھا۔ ابھی قافلہ پہنچنے ہی  
نہ پایا تھا کہ حضرت موسیٰ اکیلے روانہ ہو گئے اور ماضی دے دی۔ اُس موقع پر جو معاملات خدا اور بندے کے درمیان  
ہوتے ان کی تفصیلات سورہ اعراف رکوع ۷۰ میں درج ہیں۔ حضرت موسیٰ کا دیدار الہی کی استدعا کرنا اور اللہ تعالیٰ کا فرمانا  
کہ توجھے نہیں دیکھ سکتا، پھر اللہ کا ایک پہلہ پر ذرا سی تعلق فرما کر اسے بیزہ ریزہ کر دینا اور حضرت موسیٰ کا بیہوش ہو کر گر پڑنا،  
اس کے بعد پیچھڑکی تختیوں پر لکھے ہوئے احکام عطا ہونا، یہ سب اُسی وقت کے واقعات ہیں۔ یہاں ان واقعات  
کا صرف وہ حصہ بیان کیا جا رہا ہے جو بنی اسرائیل کی گمراہی پرستی سے متعلق ہے۔ اس کے بیان سے مقصود کفار مکہ کو یہ بتانا  
ہے کہ ایک قوم میں بت پرستی کا آغاز کس طرح بڑا کرتا ہے، اور اللہ کے نبی اس نفع کو اپنی قوم میں سراٹھاتے دیکھ کر کیسے  
بے تاب ہو جا کرتے ہیں۔

۱۲۱ یہ اس شخص کا نام نہیں ہے، بلکہ یاتے نسبتی کی صریح علامت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہر حال کوئی نہ کوئی  
نسبت ہی ہے۔ خواہ قبیلے کی طرف ہو یا نسل کی طرف یا مقام کی طرف۔ پھر قرآن جس طرح سامری کہہ کر اس کا ذکر کیا  
ہے اُس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں سامری قبیلے یا نسل یا مقام کے بہت سے لوگ موجود تھے جن میں  
سے ایک خاص سامری وہ شخص تھا جس نے بنی اسرائیل میں سنہری پچھڑے کی پرستش پھیلائی۔ اس سے زیادہ کوئی تشریح  
قرآن کے اس مقام کی تفسیر کے لیے فی الحقیقت درکار نہیں ہے۔ لیکن یہ مقام اُن اہم مقامات میں سے ہے جہاں عیسائی  
مشرکوں، اور خصوصاً مغربی مستشرقین نے قرآن پر حرف گیری کی حد کر دی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ معاذ اللہ، قرآن کے  
سنسف کی جہالت کا صریح ثبوت ہے، اس لیے کہ دولت اسرائیل کا دالاسلطنہ سامریہ اس واقعہ کے کئی صدی بعد

موسیٰ سخت غصے اور رنج کی حالت میں اپنی قوم کی طرف پلٹا۔ جا کر اس نے کہا: "اے میری قوم کے لوگو! کیا تمہارے رب نے تم سے اچھے وعدے نہیں کیے تھے؟ کیا تمہیں دن

۹۲۵ء ق م کے قریب زمانے میں تعمیر ہوا۔ پھر اس کے بھی کئی صدی بعد اسرائیلیوں اور غیر اسرائیلیوں کی وہ مختلط نسل پیدا ہوئی جس نے "سامریوں" کے نام سے شہرت پائی۔ ان کا خیال یہ ہے کہ ان سامریوں میں چونکہ دوسری مشرکانہ بدعت کے ساتھ ساتھ سہری پچڑے کی پرستش کا رواج بھی تھا، اور یہودیوں کے مذہب سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی سُن گُن پائی ہوگی، اس لیے انہوں نے بے جا کہ اس کا تعلق حضرت موسیٰ کے عہد سے جوڑ دیا اور یہ تفسیر کر ڈالا کہ وہاں سہری پچڑے کی پرستش رائج کہے جانے والی ایک سامری شخص تھا۔ اسی طرح کی باتیں ان لوگوں نے ہامان کے معاملہ میں بھی بنائی ہیں جیسے قرآن فرعون کے وزیر کی سمیٹ سے پیش کرتا ہے، اور عیسائی مشنری اور مستشرقین نے اسے خسویرس رشا و ایران کے درباری امیر ہامان سے بے جا کر ملا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ قرآن کے مصنف کی جہالت کا ایک اہم ثبوت ہے۔ شاید ان مدعیان علم و تحقیق کا گمان یہ ہے کہ قدیم زمانے میں ایک نام کا ایک ہی شخص یا قبیلہ یا مقام ہوا کرتا تھا اور ایک نام کے دو یا زائد اشخاص یا قبیلہ و مقام ہونے کا کوئی امکان نہ تھا۔ حالانکہ تیسری قدیم تاریخ کی ایک نہایت مشہور قوم تھی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد میں عراق احواس کے آس پاس کے علاقوں پر چھائی ہوئی تھی اور اس بات کا بہت امکان ہے کہ حضرت موسیٰ کے عہد میں اس قوم کے، یا اس کی کسی شاخ کے لوگ مصر میں سامری کہلاتے ہوں۔ پھر خود اس سامریہ کی اصل کو بھی دیکھ لیجیے جس کی نسبت سے شمالی فلسطین کے لوگ بعد میں سامری کہلائے گئے۔ بائبل کا بیان ہے کہ دولت اسرائیل کے فرزند و امیری نے ایک شخص "سمر" نامی سے وہ پہاڑ خریدا تھا جس پر اس نے بعد میں اپنا دار السلطنت تعمیر کیا۔ اور چونکہ پہاڑ کے سابق ملک کا نام سمر تھا اس لیے اس شہر کا نام سامریہ رکھا گیا۔ (سلاطین، باب ۱۶، آیت ۲۴)۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ سامریہ کے وجود میں آنے سے پہلے "سمر" نام کے اشخاص پائے جاتے تھے اور ان سے نسبت پا کر ان کی نسل یا قبیلہ کا نام سامری، اور مقدمات کا نام سامریہ ہونا کم از کم ممکن ضرور تھا۔

۹۲۵ء - اچھا وعدہ نہیں کیا تھا، بھی ترجمہ ہو سکتا ہے قہن میں جو ترجمہ ہم نے اختیار کیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ آج تک تمہارے رب نے تمہارے ساتھ ختمی جلائیوں کا وعدہ بھی کیا ہے وہ سب تمہیں حاصل ہوتی رہی ہیں۔ تمہیں مصر سے

۱۰۹ لگ گئے ہیں یا تم اپنے رب کا غضب ہی اپنے اوپر لانا چاہتے تھے کہ تم نے مجھ سے وعدہ خلافی کی؟ انہوں نے جواب دیا ہم نے آپ سے وعدہ خلافی کچھ اپنے اختیار سے نہیں کی، معاملہ یہ ہوا کہ ہم لوگوں کے زیورات کے بوجھ سے لو گئے تھے اور ہم نے بس ان کو چھینک دیا تھا۔

بجز یہ نکالا، غلامی سے نجات دی، تمہارے دشمن کو تس نہیں کیا، تمہارے لیے بن صحراؤں اور پہاڑی علاقوں میں سائے اور خوراک کا بندوبست کیا۔ کیا یہ سائے اچھے وعدے پورے نہیں ہوئے؟ دوسرے تہجے کا مطلب یہ ہوگا کہ تمہیں شریعت اور ہدایت نامہ عطا کرنے کا جو وعدہ کیا گیا تھا، کیا تمہارے نزدیک وہ کسی خیر اور بھلائی کا وعدہ نہ تھا؟

۱۱۰ دوسرا تہجہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کیا وعدہ پورا ہونے میں بہت دیر لگ گئی کہ تم بے صبر ہو گئے؟ پہلے تہجے کا مطلب یہ ہوگا کہ تم پر اللہ تعالیٰ اچھی اچھی جو عظیم الشان احسانات کر چکا ہے، کیا ان کو کچھ بہت زیادہ مدت گزری ہے کہ تم انہیں بھول گئے؟ کیا تمہاری مصیبت کا زمانہ جتنے قرین گزر چکی ہیں کہ تم سرست ہو کر بھگنے لگے؟ دوسرے تہجے کا مطلب صاف ہے کہ ہدایت نامہ عطا کرنے کا جو وعدہ کیا گیا تھا، اس کے دفا ہونے میں کوئی تاخیر تو نہیں ہوئی ہے جس کو تم اپنے لیے عذر اور بہانہ بنا سکو۔

۱۱۱ اس سے مراد وہ وعدہ ہے جو ہر قوم اپنے نبی سے کرتی ہے اس کے اتباع کا وعدہ۔ اس کی دی ہوئی ہدایت پر ثابت قدم رہنے کا وعدہ۔ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرنے کا وعدہ۔

۱۱۲ یہ ان لوگوں کا عذر تھا جو سامری کے فتنے میں مبتلا ہوئے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہم نے تو زیورات بھینک دیئے تھے، نہ ہماری نیت کوئی بچھا بنانے کی تھی، نہ ہمیں معلوم تھا کہ کیا بننے والا ہے۔ اس کے بعد جو معاملہ پیش آیا وہ تھا یہی کچھ ایسا کہ اسے دیکھ کر ہم بے اختیار شرک میں مبتلا ہو گئے۔

۱۱۳ ہم لوگوں کے زیورات کے بوجھ سے لا گئے تھے، اس کا سیدھا مطلب تو یہ ہے کہ ہمارے مردوں اور عورتوں نے مصر کی رسموں کے مطابق جو بھاری بھاری زیورات پہن رکھے تھے وہ اس صحرا فردی میں ہم پر بار ہو گئے تھے اور ہم پریشان تھے کہ اس بوجھ کو کہاں تک لادے پھریں لیکن بائبل کا بیان ہے کہ یہ زیورات مصر سے چلتے وقت ہر اسرائیلی مگرانے کی حدتوں اور مردوں نے اپنے مصری ٹیوٹی سے مانگنے کو لیے تھے اور اس طرح ہر ایک اپنے ٹیوٹی کو لوٹ کر مالوں کی ہجرت کے لیے چل پڑا ہوا تھا۔ یہ اخلاقی کارنامہ صرف اسی حد تک نہ تھا کہ ہر اسرائیلی نے بطور خود اسے انجام دیا ہو۔

پھر اسی طرح سامری نے بھی کچھ ڈالا اور ان کے لیے ایک بچھڑے کی صورت بنا کر نکال لایا جس میں سے بلکہ یہ کار خیر اللہ کے نبی حضرت موسیٰ نے ان کو سکھایا تھا، اور نبی کو بھی اس کی ہدایت خود اللہ میاں نے کی تھی۔ بائبل کی کتاب خروج میں ارشاد ہوتا ہے :-

”خدا نے موسیٰ سے کہا . . . . . جا کر اسرائیلی بزرگوں کو ایک جگہ جمع کر اور ان کو کہہ . . . . . کہ جب تم نکلو گے تو خالی ہاتھ نہ نکلو گے بلکہ تمہاری ایک ایک عورت اپنی پٹوسن سے اور اپنے اپنے گھر کی چٹا سے سونے چاندی کے زیور اور لباس مانگ لیں ان کو تم اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کو پہناؤ گے اور مصریوں کو لوٹ لو گے“ (بائبل آیت ۱۲-۱۱) اور خداوند نے موسیٰ سے کہا . . . . . سو اب تو لوگوں کے کان میں یہ بات ڈال دے کہ ان میں سے ہر شخص اپنے پٹوسی اور ہر عورت اپنی پٹوسن سے سونے چاندی کے زیور لے، اور خداوند نے ان لوگوں پر مصریوں کو جہریاں کر دیا“ (باب ۱۱ - آیت ۲-۳)

”اور نبی اسرائیل نے موسیٰ کے کہنے کے موافق یہ بھی کیا کہ مصریوں سے سونے چاندی کے زیور اور کپڑے مانگ لیے اور خداوند نے ان لوگوں کو مصریوں کی نگاہ میں ایسی عزت بخشی کہ جو کچھ انہوں نے مانگا، انہوں نے دیا۔ سو انہوں نے مصریوں کو لوٹ لیا“ (باب ۱۲ - آیت ۳۵-۳۶)

افسوس ہے کہ ہمارے مفسرین نے بھی قرآن کی اس آیت کی تفسیر میں نبی اسرائیل کی اس روایت کو آنکھیں بند کر کے نقل کر دیا ہے اور ان کی اس غلطی سے مسلمانوں میں بھی یہ خیال پھیل گیا ہے کہ زیور رات کا یہ بوجھ اسی ٹوٹ کا بوجھ تھا۔ آیت کے دوسرے ٹکڑے اور ہم نے بس ان کو چھینک دیا تھا ”کا مطلب ہماری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ جب اپنے زیورات کو ادے پھرنے سے لوگ تنگ آگئے ہونگے تو باہم مشورے سے یہ بات قرار پائی ہوگی کہ سب کے زیورات ایک جگہ جمع کر لیں، اور یہ ٹوٹ کر لیا جائے کہ کس کا کتنا سونا اور کس کی کتنی چاندی ہے، پھر ان کو گلا کر اینٹوں اور سلانوں کی شکل میں ڈھال لیا جائے، تاکہ قوم کے مجموعی سامان کے ساتھ گدھوں اور سیلوں پر ان کو لاد کر چلا جائے چنانچہ اس فریو لو کے مطابق ہر شخص اپنے زیورات لالا کر ڈھیر میں پھینکا چلا گیا ہوگا۔

یہاں سے پیرا گراف کے آخر تک کی عبارت پر غور کرنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ قوم کا جواب ”چھینک دیا تھا“ پر ختم ہو گیا ہے اور بعد کی یہ تفصیل اللہ تعالیٰ خود تبارہا ہے۔ اس سے صورت و انداز یہ معلوم ہوتی ہے کہ لوگ

بیل کی سی آواز نکلتی تھی۔ لوگ پکار اٹھے یہی ہے تمہارا خدا اور موسیٰ کا خدا۔ موسیٰ اسے بھول گیا، کیا وہ دیکھتے نہ تھے کہ نہ وہ ان کی بات کا جواب دیتا ہے اور نہ ان کے نفع و نقصان کا کچھ اختیار رکھتا ہے؟  
 ہارون دموسیٰ کے آنے سے پہلے ہی ان سے کہہ چکا تھا کہ لوگو، تم اس کی وجہ سے نقتنے میں پڑ گئے ہو، تمہارا رب تو رحمن ہے، پس تم میری پیروی کرو اور میری بات مانو، مگر انہوں نے اس سے کہہ دیا کہ ہم تو اس کی پشت پناہی کرتے رہیں گے جب تک کہ موسیٰ واپس نہ آجائے۔<sup>۶۹</sup>

پیش آئے والے نقتے سے بے خبر اپنے زبور لاکر ڈھیر کرنے چلے گئے۔ اور سامری صاحب بھی ان میں شامل تھے بعد میں زبور گلانے کی خدمت سامری صاحب نے اپنے ذمے لے لی، اور کچھ ایسی چال چلی کہ سونے کی اینٹیں یا سلاخیں بنانے کے بجائے ایک بچھڑے کی صورت بھٹی سے برآمد ہوئی جس میں سے بیل کی سی آواز نکلتی تھی۔ اس طرح سامری نے قوم کو دھوکا دیا کہ میں تو صرف سونا گلانے کا قصور دار ہوں، یہ تمہارا خدا آپ ہی اس شکل میں جلوہ فرما ہو گیا ہے۔

<sup>۶۹</sup> بائبل اس کے برعکس حضرت ہارون پر الزام رکھتی ہے کہ بچھڑا بنانے اور اسے معبود قرار دینے کا گناہ عظیم انہی سے سرزد ہوا تھا۔

اُد جب لوگوں نے دیکھا کہ موسیٰ نے پہاڑ سے اترنے میں دیر لگائی تو وہ ہارون کے پاس صبح ہو کر اس سے کہنے لگے کہ اٹھ ہمارے لیے دیتا بنا دے جو ہمارے آگے چلے، کیونکہ ہم نہیں جانتے کہ اس مرد موسیٰ کو، جو ہم کو ملک مصر سے نکال کر لایا، کیا ہو گیا۔ ہارون نے ان سے کہا تمہاری بیویوں اور لڑکوں اور لڑکیوں کے کانوں میں جو سونے کی بالیاں ہیں ان کو اندر میرے پاس لے آؤ چنانچہ سب لوگ ان کے کانوں سے سونے کی بالیاں اتار اتار کر ہارون کے پاس لے آئے۔ اور اس نے ان کو ان کے ہاتھوں سے لے کر ایک ڈھالا بٹھا بچھڑا بنایا جس کی صورت مہینی سے ٹھیک کی۔ تب وہ کہنے لگے آسے اسرائیل یہی تیرا دوتا ہے جو تجھ کو ملک مصر سے نکال کر لایا۔ یہ دیکھ کر ہارون نے اس کے آگے ایک قربان گاہ بنائی اور اس نے اعلان کر دیا کہ کل خداوند کے لیے عید ہوگی۔ (خروج، باب ۳۲ - آیت ۱-۵)

بہت ممکن ہے کہ بنی اسرائیل کے ہاں یہ غلط روایت اس وجہ سے مشہور ہوئی ہو کہ سامری کا نام بھی ہارون ہی ہوا اور بعد کے لوگوں نے اس ہارون کو ہارون نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ خلط ملط کر دیا ہو۔ لیکن آج عیسائی مشنریوں

موسیٰ (قوم کو ڈرانٹھنے کے بعد ہارون کی طرف پٹیا اور) بولا "ہارون، تم نے جب دیکھا تھا کہ یہ گمراہ ہوتے ہیں تو کس چیز نے تمہارا ہاتھ پکڑا تھا کہ میرے طریقے پر عمل نہ کرو؟ کیا تم نے میرے حکم کی خلاف ورزی کی؟"

اور مغربی مستشرقوں کو اصرار ہے کہ قرآن یہاں بھی ضرور غلطی پر ہے، پچھڑے کو خدا اُن کے مقدس نبی نے ہی بنایا تھا اور اُن کے دامن سے اس داغ کو صاف کر کے قرآن نے ایک احسان نہیں بلکہ الٹا تصور کیا ہے۔ یہ ہے ان لوگوں کی مہذب دھری کا حال۔ اور ان کو نظر نہیں آتا کہ اسی باب میں چند سطر آگے چل کر خود بائبل اپنی غلط بیانی کا راز کس طرح فاش کر رہی ہے۔ اس باب کی آخری دس آیتوں میں بائبل یہ بیان کرتی ہے کہ حضرت موسیٰ نے اس کے بعد بنی لادی کو جمع کیا اور اللہ تعالیٰ کا یہ حکم سنایا کہ جن لوگوں نے شرک کا یہ گناہ عظیم کیا ہے انہیں قتل کیا جائے، اور ہر ایک مومن خود اپنے ہاتھ سے اپنے اُس بھائی اور ساتھی اور پڑوسی کو قتل کرے جو کہ سالہ پستی کا مرتکب ہوا تھا۔ چنانچہ اُس روز تین ہزار آدمی قتل کیے گئے۔ اب سوال یہ ہے کہ حضرت ہارون کیوں چھوڑ دیے گئے؟ اگر وہی اس جرم کے بانی مبنائی تھے، تو انہیں اس قتل عام سے کس طرح معاف کیا جاسکتا تھا؟ کیا بنی لادی یہ نہ کہتے کہ موسیٰ ہم کو تو حکم دیتے ہو کہ ہم اپنے گناہ گار بھائیوں اور ساتھیوں اور پڑوسیوں کو اپنے ہاتھوں سے قتل کریں، مگر خود اپنے بھائی پر ہاتھ نہیں اٹھانے حالانکہ اصل گناہ گار وہی تھا؟ آگے چل کر بیان کیا جاتا ہے کہ موسیٰ نے خداوند کے پاس جا کر عرض کیا کہ اب بنی اسرائیل کا گناہ معاف کر دے، ورنہ میرا نام اپنی کتاب میں سے مٹا دے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے جواب دیا کہ جس نے میرا گناہ کیا ہے میں اسی کا نام اپنی کتاب میں سے مٹاؤں گا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت ہارون کا نام نہ مٹایا گیا۔ بلکہ اس کے برعکس اُن کو اور ان کی اولاد کو بنی اسرائیل میں بزرگ ترین منصب، یعنی بنی لادی کی سرداری اور منصب کی کہانت سے سرفراز کیا گیا۔ (گنتی، باب ۱۸- آیت ۱-۷) کیا بائبل کی یہ اندرونی شہادت خود اُس کے اپنے سابق بیان کی تردید اور قرآن کے بیان کی تصدیق نہیں کر رہی ہے؟

نکحہ حکم سے مراد وہ حکم ہے جو پہاڑ پر جانے وقت، اور اپنی جگہ حضرت ہارون کو بنی اسرائیل کی سرداری سونپتے وقت حضرت موسیٰ نے دیا تھا۔ سورۃ اعراف میں اسے ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: وَقَالَ مُوسَىٰ لِأَخِيهِ هَارُونَ اخْلُفْنِي فِي قَوْمِي وَأَصْبِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيلَ الْمُفْسِدِينَ۔ اور موسیٰ نے (جاتے ہوئے) اپنے بھائی ہارون سے کہا کہ تم میری قوم میں میری جانشینی کرو اور دیکھو، اصلاح کرنا۔ مفسدین کے طریقے کی پیروی نہ کرنا۔ (دکوحہ ۱۷)



ہارون نے جواب دیا "اے میری ماں کے بیٹے، میری ڈاڑھی نہ پکڑ، نہ میرے سر کے بال کھینچ۔  
مجھے اس بات کا ڈر تھا کہ تو آکر کہیگا تم نے بنی اسرائیل میں پھوٹ ڈال دی اور میری بات کا پاس نہ کیا۔"  
موسیٰ نے کہا "اور سامری، تیرا کیا معاملہ ہے؟"

اس نے جواب دیا "میں نے وہ چیز دکھی جو ان لوگوں کو نظر نہ آئی، پس میں نے رسول کے نقش قدم سے  
ایک مٹی اٹھالی اور اس کو ڈال دیا۔ میرے نفس نے مجھے کچھ ایسا ہی سمجھایا۔"

۱۷ سورہ اعراف میں ہے کہ حضرت موسیٰ نے پتھر کی دو تختیاں، جو پیشی خداوندی سے لائے تھے، پھینک دیں اور بھائی  
کے سر کے بال پکڑ کر انہیں اپنی طرف کھینچا (رکوع ۱۸)۔

۱۸ دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "میرے حکم کا انتظار نہ کیا"۔ سورہ اعراف میں حضرت ہارون کے جواب کی مزید  
تفصیل یہ دی گئی ہے کہ قیوم نے مجھے کمزور سمجھ کر دبا لیا اور قریب تھا کہ یہ لوگ، مجھے مار ڈالتے۔ اس مقام کے ترجمے میں ہم نے  
اس بات کو ملحوظ رکھا ہے کہ حضرت موسیٰ چھوٹے بھائی تھے مگر منصب کے لحاظ سے بڑے تھے، اور حضرت ہارون بڑے  
بھائی تھے مگر منصب کے لحاظ سے چھوٹے تھے۔

۱۹ اس آیت کی تفسیر میں دو گروہوں کی طرف سے عجیب پھینچ تان کی گئی ہے۔

ایک گروہ، جس میں قدیم مفسرین اور قدیم طرز کے مفسرین کی بڑی اکثریت شامل ہے، اس کا یہ مطلب بیان کرتا ہے کہ  
"سامری نے رسول، یعنی حضرت جبریل کو گزرتے ہوئے دیکھ لیا تھا، اور ان کے نقش قدم سے ایک مٹی بھر مٹی اٹھالی تھی، اور یہ  
اسی مٹی کی کرامت تھی کہ جب اسے بچھڑے کے بت پر ڈالا گیا تو اس میں زندگی پیدا ہو گئی اور جیتے جاگتے بچھڑے کی آواز  
نکلنے لگی۔" حالانکہ قرآن یہ نہیں کہہ رہا ہے کہ فی الواقع ایسا ہوا تھا۔ وہ صرف یہ کہہ رہا ہے کہ حضرت موسیٰ کی باز پرس کے جواب  
میں سامری نے یہ بات بنائی۔ پھر سامری سمجھ میں نہیں آتا کہ مفسرین اس کو ایک امر واقعی، اور قرآن کی بیان کردہ حقیقت کیسے  
سمجھ بیٹھے۔

دوسرا گروہ سامری کے قول کو ایک اور ہی معنی پہناتا ہے۔ اس کی تاویل کے مطابق سامری نے دراصل یہ کہا تھا کہ  
"مجھے رسول، یعنی حضرت موسیٰ میں، یا ان کے دین میں وہ کمزوری نظر آئی جو وہ مشرکوں کو نظر نہ آئی۔ اس لیے میں نے ایک خوک  
تو اس کے نقش قدم کی پیروی کی، مگر بعد میں اسے چھوڑ دیا۔" یہ تاویل غالباً سب سے پہلے ابو مسلم اسفہانی کو سوجھی تھی، پھر انام

رازی نے اس کو اپنی تفسیر میں نقل کر کے اس پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ اور اب نئے نئے مفسرین بالعموم اسی کو ترجیح دے رہے ہیں۔ لیکن یہ حضرات اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ قرآن معقول اور پھیلویوں کی زبان میں نازل نہیں ہوا ہے بلکہ صاف اور عام فہم عربی میں نازل ہوا ہے جس کو ایک عام عرب اپنی زبان کے معروف محاورے کے مطابق سمجھ سکے۔ کوئی شخص جو عربی زبان کے معروف محاورے اور دوزرہ سے واقف ہو، کبھی یہ نہیں مان سکتا کہ سامی کے اس مافی التفسیر کو ادا کرنے کے لیے عربی میں درہ الفاظ استعمال کیے جائیں گے جو آیت زیر تفسیر میں پائے جاتے ہیں۔ وہ ایک عام عرب ان الفاظ کو سن کر کبھی وہ مطلب لے سکتا ہے جو یہ حضرات بیان کر رہے ہیں۔ لغت کی کتابوں میں سے کسی لفظ کے وہ مختلف معنیوں کی تلاش کر لیتا جو مختلف محاوروں میں اس سے مراد لیے جاتے ہوں، اسان میں سے کسی مفہوم کو لاکر ایک ایسی عبارت میں چسپاں کر دیتا جہاں ایک عرب اس لفظ کو ہرگز اس مفہوم میں استعمال نہ کرے گا، زبان والی تو نہیں ہو سکتا، البتہ سخن سازی کا کرتب ضرور مانا جا سکتا ہے۔ اس قسم کے کرتب نہ ہنگامہ آسذیب ہاتھ میں لے کر لکھ کوئی شخص خود ان حضرات کی اردو تحریروں میں، یا آنسوؤں دکنٹری سے کرانچ کی انگریزی تحریروں میں، دکھانے شروع کر دے، تو شاید اپنے غلام کی چوٹی ہی تاویلیں سن کر یہ عقداں بیچیں اٹھیں۔ بالعموم قرآن میں ایسی تاویلیں اس وقت کی جاتی ہیں جبکہ ایک شخص کسی آیت کے صاف اور سیدھے مطلب کو دیکھ کر اپنی دانستہ میں یہ سمجھتا ہے کہ یہاں تو اللہ میاں سے بڑے اعتبار سے استعمال ہو گئی، لاؤ میں لکھ کی بات اس طرز بناؤں کہ ان کی غلطی کا پتہ دیکھ جائے اور لوگوں کو ان پر غصے کا موقع نہ ملے۔

اس طرز فکر کو پھیلنا جو شخص ہی اس سلسلہ کا نام میں اس ہائینٹ کو پڑھے گا وہ اس کا اگے ساتھ یہ سمجھ لیتا کہ سامی ایک قاتل پر واز شخص تھا جس نے عرب کو سچ سمجھا کر ایک زبردست طرہ فریب کی اسکیم تیار کر لی تھی اس نے عرب کو یہی نہیں کیا کہ سونے کا بچھا بنا کر اس میں کسی تہ پیر سے بچھے کی سی آوازیں پڑا کر دی اور سامی قوم کے جہاں و ناوان لوگوں کو دھوکے میں ڈال دیا۔ بلکہ اس پر مزید یہ جرات بھی کی کہ خود حضرت موسیٰ کے سامنے ایک پو فریب، امتنان لگا کر رکھ دی تاکہ اس نے دعویٰ کیا کہ مجھے وہ بچھ نظر آیا جو وہ لوگوں کو نظر نہ آتا تھا۔ اور ساتھ ساتھ یہ فرمان بھی ملے کہ یہاں رسول اللہ کے نقش قدم کی ایک مشقی جبرمٹی سے یہ کرامت صادر ہوئی ہے۔ رسول سے مراد انہوں سے کہ جبریل ہی ہوں، میرا کہ قدیم عربوں نے سمجھا ہے لیکن اگر یہ مان لیا جائے کہ اس نے رسول کا لہذا خود حضرت موسیٰ کے لیے استعمال کیا تھا، تو یہ اس کی ایک اور کئی تھی وہ اس طرح حضرت موسیٰ کو نہ ہنی رتوت دینا چاہتا تھا تاکہ وہ اسے اپنے نقش قدم کا ثقی کا کرتب سمجھ رہیوں جائیں

موسیٰ نے کہا: اچھا تو جیسا، اب زندگی بھر تجھے یہی پکارتے رہنا ہے کہ مجھے نہ چھوٹا۔ اور تیرے لیے باز پرس کا ایک وقت مقرر ہے جو تجھ سے ہرگز نہ ٹلے گا۔ اور دیکھا اپنے اس خدا کو جس پر تو ریجا ہوا تھا اب ہم اسے جلا ڈالیں گے اور ریزہ ریزہ کر کے دریا میں بہا دیں گے۔ لوگو، تمہارا خدا تو بس ایک اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی اور خدا نہیں ہے، ہر چیز پر اس کا علم حاوی ہے۔“

اور اپنی مزید کرامتوں کا اشتہار دینے کے لیے سامری کی خدمات مستقل طور پر حاصل کر لیں۔ تو قرآن اس سارے معاملے کو سامری کے فریب ہی کی حیثیت سے پیش کر رہا ہے، اپنی طرف سے بطور واقعہ بیان نہیں کر رہا ہے کہ اس سے کوئی قباحت لازم آتی ہو اور لعنت کی کتابوں سے مدد لے کر خواہ مخواہ کی سخن سازی کرنی پڑے۔ بلکہ بعد کے فقرے میں حضرت موسیٰ نے حسن طرح اس کو ٹھیک لایا ہے اور اس کے لیے منزا تجویز کی ہے اس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ اس کے گھٹے ہوئے اس پر فریب افسانے کو سنتے ہی اس کے منہ پر یاد دیا گیا۔

یعنی صرف یہی نہیں کہ زندگی بھر کے لیے معاشرے سے اس کے تعلقات توڑ دیے گئے اور اسے اچھوت بنا کر رکھ دیا گیا، بلکہ یہ ذمہ داری بھی اسی پر ڈالی گئی کہ ہر شخص کو وہ خود اپنے اچھوت پن سے آگاہ کرے اور وہی سے لوگوں کو مطلع کرتا رہے کہ میں اچھوت ہوں، مجھے ہاتھ نہ لگانا۔ بائبل کی کتاب اجمار میں کوڑھیلوں کی چھوت سے لوگوں کو بچانے کے لیے جو قواعد بیان کیے گئے ہیں ان میں سے ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ:

”اور جو کوڑھی اس بلا میں مبتلا ہو اس کے کپڑے پٹھے اور اس کے سر کے بال بکھرے رہیں اور وہ اپنے اوپر کے ہونٹ کو ڈھانکے اور چلا چلا کر کہے ناپاک ناپاک۔ چہنئے و نرن تک وہ اس بلا میں مبتلا رہے وہ ناپاک رہے گا اور وہ بے بھی ناپاک۔ پس وہ اکیلا رہے، اس کا مکان لٹ کر گاہ کے باہر ہو۔“ (باب ۱۳- آیت ۲۵-۲۶)

اس سے گمان ہوتا ہے کہ یا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب کے طور پر اس کو کوڑھ کے مرض میں مبتلا کر دیا گیا ہوگا، یا پھر اس کے لیے یہ منزا تجویز کی گئی ہوگی کہ جس طرح جسمانی کوڑھ کا مرض لوگوں سے الگ کر دیا جاتا ہے اسی طرح اس لفظی کوڑھ کے مرض کو بھی الگ کر دیا جائے، اور یہ بھی کوڑھی کی طرح پکار پکار کر ہر قریب آنے والے کو مطلع کرتا رہے کہ میں ناپاک ہوں، مجھے نہ چھوٹا۔

اُسے محمدؐ، اس طرح ہم پچھلے گزرے ہوئے حالات کی خبریں تم کو سناتے ہیں، اور ہم نے خاص اپنے ہاں سے تم کو ایک ”ذکر“ (درس نصیحت) عطا کیا ہے۔ جو کوئی اس سے منہ موڑے گا وہ قیامت کے روز سخت باہر گناہ اٹھائے گا، اور ایسے سب لوگ ہمیشہ اس کے وبال میں گرفتار رہیں گے، اور قیامت کے دن ان کے لیے (اس جرم کی ذمہ داری کا بوجھ) بڑا تکلیف دہ بوجھ ہو گا۔ اس دن سب کو صور پھونکا جائے گا۔

۱۱۷۔ موسیٰ علیہ السلام کا قصہ ختم کر کے اب پھر تقریر کا رخ اُس مضمون کی طرف مڑتا ہے جس سے سورہ کا آغاز ہوا تھا۔ آگے بڑھنے سے پہلے ایک مرتبہ پلٹ کر سورہ کی ان ابتدائی آیات کو پڑھ لیجیے جن کے بعد یکا یک حضرت موسیٰ کا قصہ شروع ہو گیا تھا۔ اس سے آپ کی سمجھ میں اچھی طرح یہ بات آجائے گی کہ سورہ کا اصل موضوع بحث کیا ہے، بیچ میں قصہ موسیٰ کس لیے بیان ہوا ہے، اور اب قصہ ختم کر کے کس طرح تقریر اپنے موضوع کی طرف پلٹ رہی ہے۔

۱۱۸۔ یعنی یہ قرآن، جس کے متعلق آغاز سورہ میں کہا گیا تھا کہ یہ کوئی آن ہونا کام تم سے لینے اور تم کو نیٹھے بٹھائے ایک سختی میں مبتلا کر دینے کے لیے نازل نہیں کیا گیا ہے، یہ تو ایک یاد دہانی اور نصیحت (تذکرہ) ہے ہر اُس شخص کے لیے جس کے دل میں خدا کا کچھ خوف ہو۔

۱۱۹۔ اس میں پہلی بات تو یہ بتائی گئی کہ جو شخص اس درس نصیحت، یعنی قرآن سے منہ موڑے گا اور اس کی ہدایت و رہنمائی قبول کرنے سے انکار کرے گا، وہ اپنا ہی نقصان کرے گا، محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے پیچھے والے خدا کا کچھ نہ بگاڑے گا۔ اس کی یہ حماقت و راسل اس کی خود اپنے ساتھ دشمنی ہوگی۔ دوسری بات یہ بتائی گئی کہ کوئی شخص، جس کو قرآن کی نصیحت پہنچے اور پھر وہ اسے قبول کرنے سے پہلو تہی کرے، آخرت میں سزا پانے سے نہیں بچ سکتا۔ آیت کے الفاظ عام ہیں۔ کسی قوم، کسی ملک، کسی زمانے کے ساتھ خاص نہیں ہیں۔ جب تک یہ قرآن دنیا میں موجود ہے، جہاں جہاں جس جس ملک اور قوم کے جس شخص کو بھی یہ پہنچے گا، اس کے لیے وہی راستے کھلے ہونگے۔ تیسرا کوئی راستہ نہ ہوگا۔ یا تو اس کو ٹٹنے لہو اس کی پیروی اختیار کرے۔ یا اس کو نہ ماننے اور اس کی پیروی سے منہ موڑے۔ پہلا راستہ اختیار کرنے والے کا انجام آگے آ رہا ہے۔ اور دوسرا راستہ اختیار کرنے والے کا انجام یہ ہے جو اس آیت میں بتا دیا گیا ہے۔

۱۲۰۔ صور، یعنی زسنگھا، فرناور یا بوق۔ آج کل اسی چیز کا قائم مقام بگل ہے جو فوج کو جمع یا منتشر کرنے اور یاد دہانی دینے کے لیے بجایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی کائنات کے نظم کو سمجھانے کے لیے وہ الفاظ اور اصطلاحیں استعمال

اودھم مجرموں کو اس حال میں گھیر لائیں گے کہ ان کی آنکھیں (دہشت کے مارے) پتھرائی ہوئی ہونگی، آپس میں چپکے چپکے کہیں گے کہ دنیا میں مشکل ہی سے تم نے کوئی دس دن گزارے ہونگے۔

فرماتا ہے جو خود انسانی زندگی میں اسی سے ملتے جلتے نظم کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ ان الفاظ اور اصطلاحوں کے استعمال سے مقصود ہمارے تصور کو اصل چیز کے قریب لے جانا ہے، نہ یہ کہ ہم سلطنت الہی کے نظم کی مختلف چیزوں کو بعینہ ان محدود معنوں میں لے لیں، اور ان محدود صورتوں کی چیزیں سمجھ لیں جیسی کہ وہ ہماری زندگی میں پائی جاتی ہیں۔ قدیم زمانے سے آج تک لوگوں کو جمع کرنے اور اہم باتوں کا اعلان کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی ایسی چیز چھونکی جاتی رہی ہے جو صوریاگل سے ملتی جاتی ہو۔ اللہ تعالیٰ بتاتا ہے کہ ایسی ہی ایک چیز قیامت کے روز چھونکی جائے گی جس کی نوعیت ہمارے زندگی کی کسی ہوگی۔ ایک دفعہ چھونکی جائے گی اور سب پر موت طاری ہو جائے گی۔ دوسری دفعہ چھونکنے پر سب جی اٹھیں گے اور زمین کے ہر گوشے سے نکل نکل کر میدان حشر کی طرف دوڑنے لگیں گے۔

۹۷ اصل میں لفظ "زرقا" استعمال ہوا ہے جو اذرق کی جمع ہے یعنی لوگوں نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ وہ لوگ خود اذرق سفیدی مائل نیلگوں ہو جائیں گے کیونکہ خوف و دہشت کے مارے ان کا خون خشک ہو جائے گا اور ان کی حالت ایسی ہو جائے گی کہ گویا ان کے جسم میں خون کا ایک قطرہ تک نہیں ہے۔ اور بعض دوسرے لوگوں نے اس لفظ کو ازرق العین (کرنجی آنکھوں والے) کے معنی میں لیا ہے اور وہ اس کا مطلب یہ دیتے ہیں کہ شدت ہول سے ان کے دیدے پتھرا جائیں گے۔ جب کسی شخص کی آنکھ بے نور ہو جاتی ہے تو اس کے حذوق چشم کا رنگ سفید پڑ جاتا ہے۔

۹۸ دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ "موت کے بعد سے اس وقت تک تم کو مشکل ہی سے دس دن گزے ہونگے"۔ قرآن مجید کے دوسرے مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے روز لوگ اپنی دنیوی زندگی کے متعلق بھی یہ اندازہ لگائیں گے کہ وہ بہت تھوڑی تھی، اور موت سے لے کر قیامت تک جو وقت گزرا ہو گا اس کے متعلق بھی ان کے اندازے کچھ ایسے ہی ہونگے۔ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے قَالَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْأَرْضِ عَدَدَ سِنِينَ، قَالُوا لَبِثْنَا يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمِ فَسْتَلَّ الْعَادِيْنَ، اللہ تعالیٰ پوچھے گا تم زمین میں کتنے سال رہے ہو؟ وہ جواب دیں گے ایک دن یا دن کا ایک حصہ رہے ہونگے، شمار کرنے والوں سے پوچھ لےجیے (المؤمنون - رکوع ۶)۔ دوسری جگہ فرمایا جاتا ہے وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُونَ مَا لَبِثُوا غَيْرَ سَاعَةٍ كَذَلِكَ كَانُوا يُؤْفَكُونَ، وَقَالَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ

ہیں خوب معلوم ہے کہ وہ کیا باتیں کر رہے ہونگے (ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ) اُس وقت ان میں سے

فَاَلَا يُعْمَانُ كَفَدًا لِّبِئْسَ مِثْقَالٍ كِتَابِ اللّٰهِ اِلٰی یَوْمِ النَّبْعِثِ هٰذَا یَوْمِ النَّبْعِثِ وَ لٰكِنَّكُمْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ اُمّ حَسْبُ یَوْمِ  
قیامت قائم ہو جائے گی تو محرم لوگ قسمیں کھا کھا کہیں گے کہ ہم (موت کی حالت میں) ایک گھڑی بھر سے زیادہ نہیں پڑے  
رہے ہیں۔ اسی طرح وہ دنیا میں بھی دھوکے کھاتے رہتے تھے۔ اور جن لوگوں کو علم اور ایمان دیا گیا تھا وہ کہیں گے کہ کتاب اللہ  
کی نود سے تو ہم یوم النبعث تک پڑے رہے ہوا وہ یہ وہی یوم النبعث ہے، مگر تم جانتے نہ تھے (الرؤم - رکوع ۶)۔ ان  
مختلف تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ دنیا کی زندگی اور برزخ کی زندگی، دونوں ہی کو وہ بہت قلیل سمجھیں گے۔ دنیا کی زندگی  
کے متعلق وہ اس لیے یہ باتیں کریں گے کہ اپنی امیدوں کے بالکل خلاف جب انہیں آخرت کی ابدی زندگی میں آنکھیں کھولنی  
پڑیں گی، اور جب وہ دیکھیں گے کہ یہاں کے لیے وہ کچھ بھی تیاری کر کے نہیں آئے ہیں، تو اتنا درد و جبر کی حسرت کے ساتھ وہ  
اپنی ذمہ داری کی طرف پلٹ کر دیکھیں گے اور کب افسوس میں گے کہ چاروں کے لطف و مسرت اور فائدہ و لذت  
کی خاطر ہم نے ہمیشہ کے لیے اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار لی۔ موت کے بعد سے قیامت تک کا وقت انہیں اس لیے تھوڑا  
نظر آئے گا کہ زندگی بعد موت کو وہ دنیا میں غیر ممکن سمجھتے تھے اور قرآن کے بتائے ہوئے عالم آخرت کا سفر انہیں کبھی  
سنجیدگی کے ساتھ ان کے ذہن میں اترا ہی نہ تھا۔ یہی تصورات لیے ہوئے دنیا میں احساس و شعور کی آخری ساعت انہوں  
نے ختم کی تھی۔ اب جو اچانک وہ آنکھیں مٹے ہوئے دوسری زندگی میں بیدار ہونگے اور دوسرے ہی لمحے اپنے آپ کو ایک  
یکل یا زسنگے کی آواز پر مار چر کرتے پائیں گے تو وہ شدید گھبراہٹ کے ساتھ اندازہ لگائیں گے کہ فلاں ہسپتال میں بیہوش مچنے  
یا فلاں جہاز میں ڈوبنے یا فلاں مقام پر حادثے سے دوچار ہونے کے بعد سے اس وقت تک آخر کتنا وقت لگا ہو گا۔ ان کی  
کھوپری میں اُس وقت یہ بات سمائیگی ہی نہیں کہ دنیا میں وہ جہاں جتن ہو چکے تھے اور اب یہ وہی دوسری زندگی ہے جسے  
ہم بالکل مغربا ت کہہ کر ٹھٹھوں میں اُڑا دیا کرتے تھے۔ اس لیے ان میں سے ہر ایک یہ سمجھے گا کہ شاید میں چند گھنٹے یا چند دن  
بیہوش پڑا رہا ہوں، اور اب شاید ایسے وقت مجھے ہوش آیا ہے یا ایسی جگہ اتفاق سے پہنچ گیا ہوں جہاں کسی بڑے معاملے  
کی وجہ سے لوگ ایک طرف کو بھاگے جا رہے ہیں۔ بعد نہیں کہ آج کل کے مرنے والے صاحب لوگ صورت کی آواز کو کچھ دیر تک  
ہوائی جھنکے کا ساثرن ہی سمجھتے رہیں۔

۱۱۹ یہ عجز مقررہ ہے جو دورانِ تقریر میں سامعین کے اس شبہ کو رفع کرنے کے لیے ارتداد ہوتا ہے کہ آخر اس وقت

جو زیادہ سے زیادہ محتاط اندازہ لگائے والا ہو گا وہ کہے گا کہ نہیں، تمہاری دنیا کی زندگی بس ایک دن کی زندگی تھی۔ یہ لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ آخر اس دن یہ پہاڑ کہاں چلے جائیں گے۔ کہو کہ میرا رب ان کو دھول بنا کر اڑا دے گا اور زمین کو ایسا ہموار چٹیل میدان بنا دے گا کہ اس میں تم کوئی بل اور سُرُط نہ بچو گے۔ میدان حشر میں بھگتے ہوئے لوگ چپکے چپکے جو باتیں کریں گے وہ آج یہاں کیسے بیان ہو رہی ہیں۔

۵۸۲ یہ بھی مجلہ مقررہ ہے جو دوران تقریر میں کسی سامع کے سوال پر ارشاد ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت یہ سورت ایک الہامی تقریر کے انداز میں سنائی جا رہی ہوگی اس وقت کسی نے مذاق اڑانے کے لیے یہ سوال اٹھایا ہوگا کہ قیامت کا جو نقشہ آپ کھینچ رہے ہیں اس سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا بھر کے لوگ کسی ہموار میدان میں بھگتے چلے جا رہے ہوں گے۔ آخر یہ بڑے بڑے پہاڑ اس وقت کہاں چلے جائیں گے؟ اس سوال کا موقع سمجھنے کے لیے اس لحاظ کو لگا ہوا ہے رکھیے جس میں یہ تقریر کی جا رہی تھی۔ مکہ جس مقام پر واقع ہے اس کی حالت ایک حوض کی سی ہے جس کے چاروں طرف اونچے اونچے پہاڑ ہیں۔ مسائل نے انہی پہاڑوں کی طرف اشارہ کر کے یہ بات کہی ہوگی۔ اور وحی کے اشارہ سے جواب بر ملا اسی وقت یہ دے دیا گیا کہ یہ پہاڑ کوٹ پیٹ کر اس طرح ریزہ ریزہ کر دیئے جائیں گے جیسے ریت کے ذرے، اور ان کو دھول کی طرح اڑا کر ساری زمین ایک ایسا ہموار میدان بنا دی جائے گی کہ اس میں کوئی اونچ نیچ نہ رہے گی، کوئی تشیب و فراز نہ ہوگا، اس کی حالت ایک ایسے صاف فرش کی سی ہوگی جس میں ذرا سابل اور کوئی معمولی سی سلوٹ تک نہ ہو۔

۵۸۳ عالم آخرت میں زمین کی جوئی شکل ہونے کی اسے قرآن مجید میں مختلف مواقع پر بیان کیا گیا ہے۔ سورہ اتقاق میں فرمایا اِذَا لَارِثُنَّ مَدَّتْہَ زمین پھیلا دی جائے گی۔ سورہ انفطار میں فرمایا اِذَا الْاِیْحَارُ فُجِّرَتْ، سمندر بھاڑ دیئے جائیں گے، جس کا مطلب غالباً یہ ہے کہ سمندروں کی تہیں بھٹ جائیں گی اور سارا پانی زمین کے اندر اتر جائے گا۔ سورہ تکویر میں فرمایا اِذَا الْاِیْحَارُ فُجِّرَتْ، سمندر بھر دیئے جائیں گے یا پاٹ دیئے جائیں گے اور یہاں بتایا جا رہا ہے کہ پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر کے ساری زمین ایک ہموار میدان کی طرح کر دی جائے گی۔ اس سے جو شکل ذہن میں بنتی ہے وہ یہ ہے کہ عالم آخرت میں یہ پورا کرۃ زمین سمندروں کو پاٹ کر، پہاڑوں کو توڑ کر، تشیب و فراز کو ہموار اور جنگلوں کو صاف کر کے بالکل ایک گیند کی طرح بنا دیا جائے گا۔ یہی وہ شکل ہے جس کے متعلق سورہ ابراہیم کے آخری رکوع میں فرمایا کہ

— اس روز سب لوگ منادی کی پکار پر سیدھے چلے آئیں گے، کوئی ذرا اگڑ نہ دکھائے گا اور آوازیں رحمان کے آگے دب جائیں گی، ایک سرسراہٹ کے سوا تم کچھ نہ سنو گے۔ اس روز شفاعت کا گزرتا ہوگا الایہ کہ کسی کو رحمان اس کی اجازت دے اور اس کی بات سننا پسند کرے۔ وہ لوگوں کو اگلا بچلا

یَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ، وہ دن جبکہ زمین بدل کر کچھ سے کچھ کر دی جائے گی۔ اور یہی زمین کی وہ شکل ہوگی جس پر شتر قائم ہوگا اور اللہ تعالیٰ عدالت فرمائے گا پھر اس کی آخری اور دائمی شکل، وہ بنا دی جائے گی جس کو سورۃ زمر کے آخری رکوع میں یوں بیان فرمایا گیا ہے وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي بَدَّلْنَا دُونَنَا الْأَرْضَ نَتَبَوَّأُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَاءُ، فَنِعْمَ أَجْرُ الْعَمِلِينَ یعنی منقح لوگ کہیں گے کہ شکر ہے اُس خدا کا جس نے ہم سے اپنے وعدے پر سے کیے اور ہم کو زمین کا وارث بنا دیا، ہم اس حنت میں جہاں چاہیں اپنی جگہ بنا سکتے ہیں پس بہترین اجر ہے عمل کرنے والوں کے لیے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آخر کار یہ پورا کرنا ارض حنت بنا دیا جائے گا اور خدا کے صالح و متقی بندے اس کے وارث ہونگے۔ اُس وقت پوری زمین ایک ملک ہوگی۔ پہاڑ، سمندر، دریا، صحرا، جو آج زمین کو بے شمار ملکوں اور وطنوں میں تقسیم کر رہے ہیں، اور ساتھ ساتھ انسانیت کو بھی بانٹے دے رہے ہیں، سر سے سے موجود ہی نہ ہونگے۔

۳۵۔ اصل میں لفظ "بئس" استعمال ہوا ہے۔ جو قدموں کی آہٹ، چپکے چپکے بولنے کی آواز، اونٹ کے چلنے کی آواز اور ایسی ہی ہلکی آوازوں کے لیے بولا جاتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ وہاں کوئی آواز، بجز چلنے والوں کے قدموں کی آہٹ اور چپکے چپکے بات کرنے والوں کی کھسرتیر کے نہیں سنی جائے گی۔ ایک پُرسبیت سماں بندھا ہوا ہوگا۔

۳۶۔ اس آیت کے دو ترجمے ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ جو تمہیں میں کیا گیا ہے۔ دوسرا یہ کہ "اُس روز شفاعت کا گزرتا نہ ہوگا الایہ کہ کسی کے حق میں رحمان اس کی اجازت دے اور اس کے لیے بات سننے پر راضی ہو"۔ لفظ ایسے جامع ہیں جو دونوں مفہوموں پر حاوی ہیں۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ قیامت کے روز کسی کو دم مارنے تک کی جرأت نہ ہوگی کجا کہ کوئی سفارش کے لیے بطور خود زبان کھول سکے۔ سفارش وہی کر سکے گا جسے اللہ تعالیٰ بولنے کی اجازت دے، اور اسی کے حق میں کر سکے گا جس کے لیے بارگاہِ الہی سے سفارش کرنے کی اجازت مل جائے۔ یہ دونوں باتیں قرآن میں متعدد مقامات پر کھول کر بتادی گئی ہیں۔ ایک طرف فرمایا مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ، کون ہے جو اس کی اجازت کے بغیر اس کے حضور سفارش کر سکے (بقرہ۔ رکوع ۳۲)۔ اور يَوْمَ لَيَعْلَمُ الْبُرُوحُ وَالْمَلَائِكَةُ صَفًا



سب حال جانتا ہے اور دوسروں کو اس کا پورا علم نہیں ہے۔ لوگوں کے سر اس حقیقی و قدیم کے

لَا يَتَكَلَّمُونَ إِلَّا مَنْ أِذِنَ لَهُ الرَّحْمَنُ وَقَالَ صَوَابًا، ”وہ دن جبکہ روح اور ملائکہ سب صف بستہ کھڑے ہونگے، ذرا بات نہ کریں گے، صرف وہی بول سکے گا جسے رحمن اجازت دے اور جو ٹھیک بات کہے“ (التنبأ - رکوع ۲) مدسری طرف ارشاد ہوتا وَلَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنْ أِذِنَ لَهُ مِنْ خَشْيَتِهِ مُشْفِقُونَ، ”اور وہ کسی کی سفارش نہیں کرتے بجز اس شخص کے جس کے حق میں سفارش سننے پر رحمان، راضی ہو، اور وہ اس کے خوف سے ڈرے ڈرے رہتے ہیں“ (الانبیاء - رکوع ۲) اور کہہ من مَلِكٍ فِي السَّمَوَاتِ لَا تُغْنِي عَنْهُمْ شَيْئًا إِلَّا مَنْ بَعْدَ لَنْ يَأْتِيَ اللَّهُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيُذِيعُنِي، ”کتنے ہی فرشتے آسمانوں میں ہیں جن کی سفارش کچھ بھی مفید نہیں ہو سکتی بجز اس صورت کے کہ اللہ سے اجازت لینے کے بعد کی جائے اور ایسے شخص کے حق میں کی جائے جس کے لیے وہ سفارش سنا چاہے اور پسند کرے“ (الانجمن، رکوع ۲)

۵۸۶ یہاں وجہ بتائی گئی ہے کہ شفاعت پر یہ پابندی کیوں ہے۔ فرشتے ہوں یا انبیاء یا اولیاء، کسی کو بھی یہ معلوم نہیں ہے اور نہیں ہو سکتا کہ کس کا ریکارڈ کیسا ہے، کون دنیا میں کیا کرتا رہا ہے، اور اللہ کی عدالت میں کس میرٹ و کردار اور کسی کیسی ذمہ داریوں کے بارے کر آیا ہے۔ اس کے برعکس اللہ کو ہر ایک کے پچھلے کارناموں اور کرتوتوں کا بھی علم ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ اب اس کا موقف کیا ہے۔ نیک ہے تو کیسا نیک ہے اور مجرم ہے تو کس درجے کا مجرم ہے۔ معافی کے قابل ہے یا نہیں۔ پوری سزا کا مستحق ہے یا تخفیف اور رعایت بھی اس کے ساتھ کی جاسکتی ہے۔ ایسی حالت میں یہ کیونکر صحیح ہو سکتا ہے کہ ملائکہ اور انبیاء اور صلحاء کو سفارش کی کھلی چھٹی دے دی جائے اور ہر ایک جس کے حق میں جو سفارش چاہے کر دے۔ ایک معمولی افسر اپنے ذرا سے محکمے میں اگر اپنے ہر دوست یا عزیز کی سفارشیں سننے لگے تو چار دن میں سارے محکمے کا سنیا ناس کر کے رکھ دے گا۔ پھر جھلا زمین و آسمان کے فرمانروا سے یہ کیسے توقع کی جاسکتی ہے کہ اس کے ہاں سفارشوں کا بازار گرم ہو گا، اور ہر بزرگ جا جا کر جس کو چاہیں گے بچھڑوا لائیں گے، درآنحالیکہ ان میں سے کسی بزرگ کو بھی یہ معلوم نہیں ہے کہ جن لوگوں کی سفارش وہ کر رہے ہیں ان کے نامہ اعمال کیسے ہیں۔ دنیا میں جو افسر کچھ بھی احساس ذمہ داری رکھتا ہے اس کی روش یہ ہوتی ہے کہ اگر اس کا کوئی دوست اس کے کسی قصور و ارتکاب کی سفارش لے کر جانا ہے تو وہ اس سے کہتا ہے کہ آپ کو خبر نہیں ہے کہ آپ کو یہ شخص کتنا کام چور، نافرمان، شہساز، رشوت خوار اور خلق خدا کو تنگ

آگے جھک جائیں گے۔ نامراد ہوگا جو اُس وقت کسی ظلم کا بارگناہ اٹھائے ہوئے ہو۔ اور کسی ظلم یا تخطی کا خطرہ نہ ہوگا اُس شخص کو جو نیک عمل کرے اور اس کے ساتھ وہ مؤمن بھی ہو۔

اور اے محمد، اسی طرح ہم نے اسے قرآنِ عربی بنا کر نازل کیا ہے اور اس میں طرح طرح سے تنبیہات

کرنے والے ہیں، میں اس کے کزوتوں سے واقف ہوں، اس لیے آپ براہِ کرم مجھ سے اس کی سفارش نہ فرمائیں۔ اسی چھوٹی سی مثال پر قیاس کر کے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس آیت میں شفاعت کے متعلق جو قاعدہ بیان کیا گیا ہے وہ کس قدر صحیح، معقول اور منی بالانصاف ہے۔ خدا کے ہاں شفاعت کا دروازہ بند نہ ہوگا۔ نیک بندے، جو دنیا میں خلقِ خدا کے ساتھ ہمدردی کا برتاؤ کرنے کے عادی تھے، انہیں آخرت میں بھی ہمدردی کا حق ادا کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ لیکن وہ سفارش کرنے سے پہلے اجازت طلب کریں گے، اور جس کے حق میں اللہ تعالیٰ انہیں بولنے کی اجازت دے گا صرف اسی کے حق میں وہ سفارش کر سکیں گے۔ پھر سفارش کے لیے بھی شرط یہ ہوگی کہ وہ مناسب اور منی برحق ہو، جیسا کہ وَقَالَ صَوَابًا (اور بات ٹھیک کہے) کا ارشادِ بانی صاف بتا رہا ہے۔ بولگی سفارش کرنے کی وہاں اجازت نہ ہوگی کہ ایک شخص دنیا میں سینکڑوں، ہزاروں بندگانِ خدا کے حقوق مارا یا سوا اور کوئی بزرگ اٹھ کر سفارش کر دیں کہ حضور اسے انعام سے سرفراز فرمائیں۔

لحہ یعنی وہاں فیصلہ ہر انسان کے اوصاف (MERITS) کی بنیاد پر ہوگا۔ جو شخص کسی ظلم کا بارگناہ اٹھائے ہوئے آئے گا، خواہ اس نے ظلم اپنے خدا کے حقوق پر کیا ہو، یا خلقِ خدا کے حقوق پر، یا خود اپنے نفس پر، بہر حال یہ چیز اُسے کامیابی کا منہ نہ دیکھنے دیگی۔ دوسری طرف جو لوگ ایمان اور عملِ صالح (محض عملِ صالح نہیں بلکہ ایمان کے ساتھ عملِ صالح، اور محض ایمان بھی نہیں بلکہ عملِ صالح کے ساتھ ایمان) لیے ہوئے آئیں گے، اُن کے لیے وہاں نہ تو اس امر کا کوئی اندیشہ ہے کہ ان پر ظلم ہوگا، یعنی خواہ مخواہ بے قصور اُن کو سزا دی جائے گی، اور نہ اسی امر کا کوئی خطرہ ہے کہ ان کے کیے کرانے پر پانی پھیر دیا جائے گا اور ان کے جائز حقوق مار کھائے جائیں گے۔

مہہ یعنی ایسے ہی مضامین اور تعلیمات اور نصائح سے لبریز۔ اس کا اشارہ اُن تمام مضامین کی طرف ہے جو قرآن میں بیان ہوئے ہیں، نہ کہ محض قریبی مضمون کی طرف جو اوپر والی آیات میں بیان ہوا ہے۔ اور اس کا سلسلہ بیان اُن آیات سے جڑتا ہے جو قرآن کے متعلق آغاز سورہ اور پھر قصہ موسیٰ کے اختتام پر ارشاد فرمائی گئی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ تذکرہ

کی میں شاید کہ یہ لوگ کچھ روی سے بچیں یا ان میں کچھ ہوش کے آثار اس کی بدولت پیدا ہوں۔  
پس بلا دوزخ ہے اللہ، پادشاہ حقیقی۔

اور دیکھو، قرآن پڑھنے میں جلدی نہ کیا کرو جب تک کہ تمہاری طرف اس کی وقتی تکمیل کو نہ پہنچ جائے، اور دعا کرو کہ اسے پروردگار مجھے مزید علم عطا کرے۔

جو تمہاری طرف بھیجا گیا ہے، اور وہ ذکر جو ہم نے خاص اپنے ہاں سے تم کو عطا کیا ہے، اس شان کا تذکرہ اور ذکر ہے۔  
یعنی اپنی غفلت سے چوکیں، بھولے ہوئے سبق کو کچھ یاد کریں، اور ان کو کچھ اس امر کا احساس ہو کہ کن راہوں میں ٹھکے چلے جا رہے ہیں اور اس گمراہی کا انجام کیا ہے۔

اس طرح کے فقرے قرآن میں بالعموم ایک تقریر کو ختم کرتے ہوئے ارشاد فرمائے جاتے ہیں، اور مقصود یہ ہوتا ہے کہ کلام کا خاتمہ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا پر ہو۔ انداز بیان اور سیاق و سباق پر غور کرنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہاں ایک تقریر ختم ہو گئی ہے اور ولعقد عہدنا الیٰ ادم سے دوسری تقریر شروع ہوتی ہے۔ اغلب یہ ہے کہ یہ دونوں تقریریں مختلف اوقات میں نازل ہوئی ہوں گی اور بعد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم الہی کے تحت ان کو ایک سورت میں جمع کر دیا ہوگا۔ جمع کرنے کی وجہ دونوں کے مضمون کی مناسبت ہے جس کو ابھی ہم وضع کریں گے۔

لَقَدْ فَتَعَلَىٰ اللَّهُ الْمَلِئِكَةُ الْحَقِّ بِرِ تَقْرِيرِ نَعْتِمْ بِرِ حَقِّ حَقِّ۔ اس کے بعد نصحت ہوتے ہوئے فرشتہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک بات پر متنبہ کرتا ہے جو وحی نازل کرنے کے دوران میں اس کے مشاہدے میں آئی۔ بیچ میں لوگنا مناسب نہ سمجھا گیا، اس لیے پیغام کی ترسیل مکمل کرنے کے بعد اب وہ اس پر ٹوک رہا ہے۔ بات کیا تھی جس پر یہ تنبیہ کی گئی؟ اسے خود تنبیہ کے الفاظ ہی ظاہر کر رہے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم وحی کا پیغام وصول کرنے کے دوران میں اسے یاد کرنے اور زبان سے دہرانے کی کوشش فرما رہے ہوں گے۔ اس کوشش کی وجہ سے آپ کی توجہ بار بار بٹ جاتی ہوگی۔ سلسلہ اغذ وحی میں خلل واقع ہو رہا ہوگا۔ پیغام کی سماعت پر توجہ پوری طرح مرکوز نہ ہو رہی ہوگی۔ اس کیفیت کو دیکھ کر یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ آپ کو پیغام وحی وصول کرنے کا صحیح طریقہ سمجھایا جائے، اور بیچ بیچ میں یاد کرنے کی کوشش جو آپ کرتے ہیں اس سے منع کر دیا جائے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سورہ ظہر کا یہ حصہ ابتدائی زمانے کی ذہیوں میں سے ہے۔ ابتدائی زمانہ میں جبکہ

ہم نے اس سے پہلے آدم کو ایک حکم دیا تھا، مگر وہ بھول گیا اور ہم نے اُس میں عسیم

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اخذ وحی کی عادت اچھی طرح نہ پڑی تھی، آپ سے کئی مرتبہ یہ فعل سرزد ہوا ہے اور ہر موقع پر کوئی نہ کوئی فقرہ اس پر آپ کو متنبہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ارشاد فرمایا گیا ہے۔ سورہ نیا مہ کے نزول کے موقع پر بھی یہی ہوا تھا اور اس پر سلسلہ کلام کو توڑ کر آپ کو ٹوکا گیا کہ لَا تَخْرُجْ بِدِلْسَانِكَ لِتَجْعَلَ بِهِ، اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ، فَاِذَا قَرَأْتَهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ، ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيِّنَاتَهُ، اُسے یاد کرنے کی جلدی میں اپنی زبان کو بار بار حرکت نہ دے، یاد کر دینا اور پڑھنا دینا ہمارے ذمہ ہے، لہذا جب ہم اسے سنا رہے ہوں تو غور سے سنتے رہو، پھر اس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے، سورہ اعلیٰ میں بھی آپ کو اطمینان دلایا گیا ہے کہ ہم اسے پڑھو ادیں گے اور آپ بھولیں گے نہیں، سَتَقْرَأُكَ فَلَا تَنْسَى۔ بعد میں جب آپ کو پیغامات وحی وصول کرنے کی اچھی عادت حاصل ہو گئی تو اس طرح کی کیفیات آپ پر طاری ہونی بند ہو گئیں۔ اسی وجہ سے بعد کی سورتوں میں ایسی کوئی تشبیہ نہیں نہیں ملتی۔

۹۲ جیسا کہ ابھی بتایا جا چکا ہے، یہاں سے ایک الگ تقریر شروع ہوتی ہے جو اعلیٰ اور پر والی تقریر کے بعد کسی وقت نازل ہوئی ہے اور مضمون کی مناسبت سے اُس کے ساتھ ملا کر ایک ہی سورتہ میں جمع کر دی گئی ہے۔ مضمون کی مناسبتیں متعدد ہیں۔ مثلاً یہ کہ:-

(۱) وہ بھولا ہوا سبق جسے قرآن یاد دلا رہا ہے وہی ہے جو نوع انسانی کی پیدائش کے آغاز میں دیا گیا تھا اور جسے یاد دلاتے رہنے کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا تھا، اور جسے یاد دلانے کے لیے قرآن سے پہلے بھی بار بار ذکر آئے ہیں۔

(۲) انسان اُس سبق کو بار بار شیطان کے بہکانے سے بھولتا ہے، اور یہ کمزوری وہ آغاز آفرینش سے برابر رکھا رہا ہے۔ سب سے پہلی بھول اُس کے اولین ماں باپ کو لاحق ہوئی تھی اور اس کے بعد سے اس کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ اسی لیے انسان اس کا محتاج ہے کہ اس کو تہیم یاد دلاتی کرائی جاتی رہے۔

(۳) یہ بات کہ انسان کی سعادت و شقاوت کا انحصار بالکل اُس پر ہے جو اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے اسے ذکر کے ساتھ وہ کرے گا، آغاز آفرینش ہی میں صاف صاف بتا دی گئی تھی۔ آج یہ کوئی نئی بات نہیں کہی جا رہی ہے کہ اس کی پیروی کرے تو نجاتی اور بدبختی سے محفوظ رہے ورنہ دنیا و آخرت دونوں میں مبتلائے مصیبت ہو گے۔

۹۳ نہ پایا۔ یاد کرو وہ وقت جبکہ ہم نے فرشتوں سے کہا تھا کہ آدم کو سجدہ کرو۔ وہ سب تو سجدہ کر گئے۔

(۳) ایک چیز ہے جھول اور غم کی کمی اور ارادے کی کمزوری جس کی وجہ سے انسان اپنے انلی دشمن، شیطان کے ہیکلے میں آجائے اور غلطی کر بیٹھے۔ اس کی معافی ہو سکتی ہے بشرطیکہ انسان غلطی کا احساس ہوتے ہی اپنے رویے کی اصلاح کرے اور خوف چھوڑ کر اطاعت کی طرف پلٹ آئے۔ دوسری چیز ہے وہ سرکشی اور سزائی اور خوب سوچ سمجھ کر اللہ کے مقابلے میں شیطان کی بندگی جس کا ارتکاب فرعون اور سامری نے کیا۔ اس چیز کے لیے معافی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اس کا انجام وہی ہے جو فرعون اور سامری نے دیکھا اور یہ انجام ہر وہ شخص دیکھے گا جو اس روش پر چلے گا۔

۹۴ آدم علیہ السلام کا قصہ اس سے پہلے سورہ بقرہ، سورہ اعراف (دو مقامات پر)، سورہ بقرہ، سورہ بنی اسرائیل اور سورہ کہف میں گزر چکا ہے۔ یہ ساتواں موقع ہے جبکہ اسے دہرایا جا رہا ہے۔ ہر جگہ سلسلہ بیان سے اس کی مناسبت الگ ہے اور ہر جگہ اسی مناسبت کے لحاظ سے قصے کی تفصیلات مختلف طریقے سے بیان کی گئی ہیں۔ قصے کے جو اجزاء ایک جگہ کے موضوع بحث سے مناسبت رکھتے ہیں وہ اسی جگہ بیان ہوئے ہیں، دوسری جگہ وہ نہیں گئے۔ یا طرز بیان ذرا مختلف ہو گا۔ پورے قصے کو اور اس کی پوری معنویت کو سمجھنے کے لیے ان تمام مقامات پر نگاہ ڈال لینی چاہیے۔ ہم نے ہر جگہ اس کے ربط و تعلق اور اس سے نکلنے والے نتائج کو اپنے حواشی میں بیان کر دیا ہے۔

۹۴ یعنی اُس نے بعد میں اس حکم کے ساتھ جو معاملہ کیا وہ استکبار اور قصدی و ارادی سرکشی کی بنا پر نہ تھا بلکہ غفلت اور جھول میں پڑ جانے اور غم و ارادے کی کمزوری میں مبتلا ہونے کی وجہ سے تھا۔ اس نے حکم کی خلاف ورزی کچھ اس خیال اور نیت کے ساتھ نہیں کی تھی کہ میں خدا کی کیا پروا کرتا ہوں، اُس کا حکم ہے تو ہوا کرے، جو کچھ میرا جی چاہے گا کروں گا، خدا کون ہوتا ہے کہ میرے معاملات میں دخل دے، اس کے بجائے اُس کی نافرمانی کا سبب یہ تھا کہ اس نے ہمارا حکم یاد رکھنے کی کوشش نہ کی، جھول گیا کہ ہم نے اسے کیا سمجھایا تھا، اور اس کے ارادے میں اتنی مضبوطی نہ تھی کہ جب شیطان اسے ہیکلے نے آیا اُس وقت وہ ہماری پیشگی تنبیہ اور نصیحت و فہمائش کو جس کا ذکر ابھی آگے آنا چاہیایا کرتا اور اس کے دیے ہوئے لایح کا سختی کے ساتھ مقابلہ کرتا۔

بعض لوگوں نے "اُس میں غم نہ پایا" کا مطلب یہ لیا ہے کہ ہم نے اس میں نافرمانی کا غم نہ پایا، یعنی اس نے

مگر ایک اہلیس تھا کہ انکار کر بیٹھا۔ اس پر ہم نے آدم سے کہا کہ ”دیکھو۔ یہ تمہارا اور تمہاری بیوی کا دشمن ہے“<sup>۹۴</sup> جو کچھ کیا مجھو سے کیا، نافرمانی کے عزم کی نیا پر نہیں کیا۔ لیکن یہ عواہ خواہ کا تکلف ہے۔ یہ بات اگر کہنی ہوتی تو لہو نجد لہ عنہما علی العصیان کہا جاتا نہ کہ محض لہ نجد لہ عنہما۔ آیت کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ فقدان عزم سے مراد اطاعتِ حکم کے عزم کا فقدان ہے، نہ کہ نافرمانی کے عزم کا فقدان۔ علاوہ بریں اگر موقع و محل اور سیاق و سباق کی مناسبت کو دیکھا جائے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ آدم علیہ السلام کی پرزین صاف کرنے کے لیے یہ قصہ بیان نہیں کر رہا ہے، بلکہ یہ بتانا چاہتا ہے کہ وہ بشری کمزوری کیا تھی جس کا صدور ان سے ہوا اور جس کی بدولت صرف وہی نہیں بلکہ ان کی اولاد بھی اللہ تعالیٰ کی پیشگی تنبیہات کے باوجود اپنے دشمن کے چھندے میں پھنسی اور پھنسی رہی ہے۔ مزید برآں، جو شخص بھی خالی الذہن ہو کر اس آیت کو پڑھے گا اس کے ذہن میں پہلا مفہوم ہی آئے گا کہ ہم نے اس میں اطاعتِ امر کا عزم، یا مضبوط ارادہ نہ پایا۔ دوسرا مفہوم اس کے ذہن میں اُس وقت تک نہیں آسکتا جب تک وہ آدم علیہ السلام کی طرف معصیت کی نسبت کو نامناسب سمجھ کر آیت کے کسی اور معنی کی تلاش شروع نہ کر دے۔ یہی بات ہے جو حضرت عمرؓ نے ابن عباس سے اس آیت کی یہ تفسیر سن کر فرمائی تھی کہ لکن لا یجفی علیک ان هذا التفسیر غیر متبادر ولا کثیر المناسبت للمقام“ مگر تم سے یہ بات پرشیدہ نہ ہوگی کہ یہ تفسیر آیت کے الفاظ سن کر فوراً ذہن میں نہیں آتی اور نہ موقع و محل کے ساتھ کچھ زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ (ملاحظہ ہو روح المعانی جلد ۱۶ صفحہ ۲۳۳)

۹۵۔ یہاں وہ اصل حکم بیان نہیں کیا گیا ہے جو آدم علیہ السلام کو دیا گیا تھا، یعنی یہ کہ اس خاص درخت کا پھل نہ کھانا۔ وہ حکم دوسرے مقامات پر قرآن مجید میں بیان ہو چکا ہے۔ اس مقام پر چونکہ بتانے کی اصل چیز صرف یہ ہے کہ انسان کس طرح اللہ تعالیٰ کی پیشگی تنبیہ اور فہمائش کے باوجود اپنے جانے بوجھے دشمن کے اغوا سے متاثر ہو جاتا ہے، اور کس طرح اس کی بی کمزوری اس سے وہ کام کرا لیتی ہے جو اس کے اپنے مفاد کے خلاف ہوتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اصل حکم کا ذکر کرنے کے بجائے یہاں اُس فہمائش کا ذکر کیا ہے جو اس حکم کے ساتھ حضرت آدمؑ کو کی گئی تھی۔

۹۶۔ دشمنی کا مظاہرہ اسی وقت ہو چکا تھا۔ آدم اور حوا، دونوں دیکھ چکے تھے کہ ابلیس نے ان کو سجدہ کرنے سے انکار کیا ہے اور صاف صاف یہ کہہ کر کیا ہے کہ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِي مِنْ نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِنْ طِينٍ میں اس سے بہتر ہوں، نہ کہ مجھ کو آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو مٹی سے، (اعراف۔ رکوع ۲۔ ص۔ رکوع ۵)۔ اَرَأَيْتَ

ایسا نہ ہو کہ یہ تمہیں جنت سے نکلوا دے اور تم مصیبت میں پڑ جاؤ۔ یہاں تو تمہیں یہ آسائشیں حاصل ہیں کہ نہ جھوکے ننگے رہتے ہو، نہ پیاس اور دھوپ تمہیں ستاتی ہے، لیکن شیطان نے تم کو پھسلایا

هَذَا الَّذِي كَرَّمْتُمْ حَلِيًّا. ذرا دیکھ تو سہی، یہ ہے وہ مہنتی جس کو تو نے مجھ پر فضیلت دی ہے؟۔ عَأْتَجِدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طَبِئًا، اب کیا میں اسے سجدہ کروں جس کو تو نے مٹی سے بنایا ہے؟ (بنی اسرائیل۔ رکوع ۲۷)۔ پھر اس پر ہی اُس نے اکتفا نہ کیا کہ حکم کھلا اپنے حسد کا اظہار کر دیا، بلکہ اللہ تعالیٰ سے اُس نے ہمت بھی مانگی کہ مجھے اپنی فضیلت اور اس کی نااہلی ثابت کرنے کا موقع دیکھیے، میں اسے بہکا کر آپ کو دکھا دوں گا کہ کیسا ہے یہ آپ کا خلیفہ۔ اعراف، حجر اور بنی اسرائیل میں اس کا یہ چیلنج گزر چکا ہے اور آگے سورہ ص میں بھی آ رہا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے جب یہ فرمایا کہ یہ تمہارا دشمن ہے، تو یہ محض ایک امر غیب کی اطلاع نہ تھی، بلکہ ایک ایسی چیز تھی جسے میں برسر موقع دونوں میاں بیوی اپنی آنکھوں دیکھ چکے اور اپنے کانوں سن چکے تھے۔

۹۷ اس طرح یہ بھی دونوں کو بتا دیا گیا کہ اگر اس کے بہکائے میں آ کر تم نے حکم کی خلاف ورزی کی تو جنت میں نہ رہ سکو گے اور وہ تمام نعمتیں تم سے چھین جائیں گی جو تم کو یہاں حاصل ہیں۔

۹۸ یہ تشریح ہے اس مصیبت کی جس میں جنت سے نکلنے کے بعد انسان کو مبتلا ہو جانا تھا۔ اس موقع پر جنت کی بڑی اور اکمل و افضل نعمتوں کا ذکر کرنے کے بجائے اس کی چار بنیادی نعمتوں کا ذکر کیا گیا، یعنی یہ کہ یہاں تمہارے لیے غذا، پانی، لباس اور مسکن کا انتظام سرکاری طور پر کیا جا رہا ہے، تم کو ان میں سے کوئی چیز بھی حاصل کرنے کے لیے محنت اور کوشش نہیں کرنی پڑتی۔ اس سے خود بخود یہ بات آدم و حوا علیہما السلام پر واضح ہو گئی کہ اگر وہ شیطان کے بہکائے میں آ کر حکم سرکار کی خلاف ورزی کریں گے تو جنت سے نکل کر انہیں یہاں کی بڑی نعمتیں تو درکنار، یہ بنیادی آسائشیں تک حاصل نہ ہوں گی جو اپنی بالکل ابتدائی ضروریات تک کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے اور اپنی جان کھپانے پر مجبور ہو جائیں گے۔ چوٹی سے اٹری تک پسینہ جیت تک نہ بہائیں گے ایک وقت کی روٹی تک نہ پائیں گے۔ معاش کی فکر ہی ان کی توجہ اور ان کے اوقات اور ان کی قوتوں کا اتنا بڑا حصہ کھینچ لے جائے گی کہ کسی بلند تر مقصد کے لیے کچھ کرنے کی نہ فرصت رہے گی نہ طاقت۔

۹۹ یہاں قرآن صاف تصریح کرتا ہے کہ آدم و حوا میں سے اصل وہ شخص جس کو شیطان نے دوسو سے بڑا



کہنے لگا۔ آدم۔ بناؤں تمہیں وہ درخت جس سے ابدی زندگی اور لازوال سلطنت حاصل ہوتی ہے؟ آخر کار دونوں زمیناں بیوی، اُس درخت کا پھل کھا گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فوراً ہی اُن کے ستر ایک دوسرے کے آگے کھل گئے اور لگے اپنے آپ کو جنت کے پتوں سے ڈھانکنے۔ آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور راہِ راست سے بھٹک گیا۔ پھر اُس کے رب نے اسے برگزیدہ

آدم علیہ السلام تھے نہ کہ حضرت حوا۔ اگرچہ سورہ اعراف کے بیان کے مطابق مخاطب دونوں ہی تھے اور بچکانے میں دونوں ہی آئے، لیکن شیطان کی دوسرہ اندازی کا رخ دراصل حضرت آدم ہی کی طرف تھا۔ اس کے برعکس بائبل کا بیان یہ ہے کہ سانپ نے پہلے عورت سے بات کی اور پھر عورت نے اپنے شوہر کو بہکا کر درخت کا پھل اسے کھلایا۔ (پیدائش، باب ۳)۔

سورہ اعراف میں شیطان کی گفتگو کی مزید تفصیل ہم کو یہ ملتی ہے وَقَالَ مَا لَهَا لَكُمْ مِنْهُ مَرْجُوا عَنْ هَذَا ۖ السُّجُودَ إِلَّا أَنْ تَكُونُوا مَلَائِكَةً أَوْ تَكُونُوا مِنَ الْخَالِدِينَ، اور اس نے کہا کہ تمہارے رب نے تم کو اس درخت سے صرف اس لیے روک دیا ہے کہ کہیں تم فرشتے نہ ہو جاؤ، یا ہمیشہ جینے نہ رہو۔

لنہ باقاعدہ دیگر نافرمانی کا صدور ہوتے ہی وہ آسائشیں اُن سے چھین لی گئیں جو سرکاری انتظام سے ان کو جہاں جاتی تھیں، اور اس کا اولین ظہور لباس چھین جانے کی شکل میں ہوا۔ غذا، پانی اور مسکن سے محرومی کی نوبت تو بعد کہہ ہی آئی تھی۔ اس کا پتہ تو بھوک پیاس لگنے پر ہی چل سکتا تھا، اور مکان سے نکلے جانے کی باری بھی بعد ہی میں آسکتی تھی۔ مگر پہلی چیز جس پر نافرمانی کا اثر پڑا وہ سرکاری پوشاک تھی جو اسی وقت اتروالی گئی۔

لنہ یہاں اُس لیسری کمزوری کی حقیقت کو سمجھ لینا چاہیے جو آدم علیہ السلام سے ظہور میں آئی۔ اللہ تعالیٰ کو وہ اپنا خالق اور رب جانتے تھے اور دل سے مانتے تھے۔ جنت میں ان کو جو آسائشیں حاصل تھیں ان کا تجربہ انہیں خود ہر وقت ہو رہا تھا۔ شیطان کے حسد اور عداوت کا بھی ان کو براہِ راست علم ہو چکا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دینے کے ساتھ ہی بنا دیا تھا کہ یہ تمہارا دشمن تمہیں نافرمانی پر آمادہ کرنے کی کوشش کرے گا اور اس کا تمہیں یہ نقصان اٹھانا پڑے گا۔ شیطان اُن کے سامنے چیلنج دے چکا تھا کہ میں اسے بہکاؤں گا اور اس کی بیخ کنی کر کے چھوڑوں گا۔ ان ساری باتوں کے باوجود جب شیطان نے ان کو ناصح مستحق اور خیر خواہ دوست کے چہرے میں آکر ایک بہتر حالت



کیا۔ اور اس کی توبہ قبول کر لی اور اسے ہدایت بخشتی تھی اور فرمایا "تم دونوں (فریق) یعنی انسان اور شیطان یہاں سے اتر جاؤ۔ تم ایک دوسرے کے دشمن رہو گے۔ اب اگر میری طرف سے تمہیں کوئی ہدایت پہنچے تو جو کوئی میری اُس ہدایت کی پیروی کرے گا وہ نہ ٹھٹھکے گا نہ بدبختی میں مبتلا ہوگا۔ اور جو میرے

دشمنی جاوواں اور سبقت لاندواں، کا لایح دلایا تو وہ اس کی تحریص کے مقابلے میں نہ جم سکے اور پھسل گئے، حالانکہ اب بھی خدا پر ان کے عقیدے میں فرق نہ آیا تھا اور اُس کے فرمان کے باوجود میں ایسا کوئی خیال ان کے ذہن میں نہیں تھا کہ وہ سرے سے واجب الاذعان ہی نہیں ہے۔ بس ایک فوری جذبے نے، جو شیطان کی تحریص کے زیر اثر ابھرا تھا، ان پر حصول طاری کر دیا اور ضبط نفس کی گرفت ڈھیلی ہونے ہی وہ طاعت کے مقام بلند سے معصیت کی پستی میں جا گرے۔ یہی وہ "بھول" اور "فقدانِ غم" ہے جس کا ذکر قصے کے آغاز میں کیا گیا تھا، اور اسی چیز کا نتیجہ وہ نافرمانی اور ٹھٹھک ہے جس کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے۔ یہ انسان کی وہ کمزوری ہے جو ابتدائے آفرینش ہی میں اس سے ظاہر ہوئی، اور بعد میں کوئی زمانہ ایسا نہیں گزر رہے جبکہ یہ کمزوری اس میں نہ پائی گئی ہو۔

سنو یعنی شیطان کی طرح سادہ درگاہ نہ کر دیا، اطاعت کی کوشش میں ناکام ہو کر جہاں وہ گر گئے تھے وہیں انہیں پڑا نہیں چھوڑ دیا، بلکہ اٹھا کر پھر اپنے پاس بلا لیا اور اپنی خدمت کے لیے چن لیا۔ ایک سلوک وہ ہے جو بالارادہ بغاوت کرنے والے اور اکڑ اور بیکڑی دکھانے والے لوگوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اس کا مستحق شیطان تھا اور ہر وہ بندہ ہے جو ڈوٹ کر اپنے رب کی نافرمانی کرے اور خم ٹھونک کر اس کے سامنے کھڑا ہو جائے۔ دوسرا سلوک وہ ہے جو اس وفادار بندے کے ساتھ کیا جاتا ہے جو محض "بھول" اور "فقدانِ غم" کی وجہ سے تصور کر گزرا ہو، اور پھر ہوش آتے ہی اپنے کیے پر شرمندہ ہو جائے۔ یہ سلوک حضرت آدم و حوا سے کیا گیا، کیونکہ اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی وہ پکار اٹھے تھے کہ رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا وَإِن لَّا تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ، "اے ہمارے پروردگار، ہم نے اپنے نفس پر ظلم کیا، اور اگر تو ہم سے درگزر نہ فرمائے اور ہم پر رحم نہ کرے تو ہم برباد ہو جائیں گے" (اعراف - رکوع ۱۲)

سنو یعنی صرف معاف ہی نہیں کیا، بلکہ آئندہ کے لیے راہِ راست بھی بتائی اور اُس پر چلنے کا طریقہ بھی سکھایا۔

”ذکر“ دریں نصیحت سے منہ موڑے گا اُس کے لیے دنیا میں تنگ زندگی ہوگی اور قیامت کے بعد ہم اسے اندھا اٹھائیں گے۔ وہ کہے گا، ”پروردگار، دنیا میں تو میں آنکھوں والا تھا، یہاں

ہنہ دنیا میں تنگ زندگی ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسے تنگ دستی لاقی ہوگی۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں اسے چین نصیب نہ ہوگا۔ کرڈرتی جی ہوگا تو بے چین رہے گا۔ ہفت اقلیم کا فرمانروا بھی ہوگا تو بے علی اور بے اطمینانی سے نجات نہ پائے گا۔ اس کی ذبیحی کامیابیاں ہزاروں قسم کی ناچانز تدبیروں کا نتیجہ ہوگی جن کی وجہ سے اپنے ضمیر سے لے کر گرد و پیش کے پورے اجتماعی ماحول تک ہر چیز کے ساتھ اس کی پیہم کشمکش جاری رہے گی جو اسے کبھی امن و اطمینان اور سچی مسرت سے پرہ مند نہ ہونے دے گی۔

۶۔ اس جگہ آدم علیہ السلام کا قصہ ختم ہو جاتا ہے۔ یہ قصہ جس طریقے سے پہلے، اور قرآن کے دوسرے مقامات پر بیان ہوا ہے، اس پر غور کرنے سے میں یہ سمجھا ہوں (واللہ اعلم بالصواب) کہ زمین کی اصل خلافت وہی تھی جو آدم علیہ السلام کو ابتداءً جنت میں دی گئی تھی۔ وہ جنت کہیں آسمانوں میں نہ تھی بلکہ اسی زمین پر کسی بلند سطح کو جنت نیا یا گیا تھا۔ وہاں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ اس شان سے رکھا گیا تھا کہ اس کے کھانے پینے اور لباس و مکان کا سارا انتظام سرکار کے ذمہ تھا اور خدمت گزار (فرشتے) اُس کے حکم کے تابع تھے۔ اس کو اپنی ذاتی ضروریات کے لیے قطعاً کوئی فکر نہ کرنی پڑتی تھی؛ تاکہ وہ خلافت کے بزرگ تر اور بلند تر وظائف ادا کرنے کے لیے مستعد ہو سکے۔ مگر اس عہدے پر مستقل تقرر ہونے سے پہلے امتحان لینا ضروری سمجھا گیا تاکہ امیدوار کی صلاحیتوں کا حال کھل جائے اور یہ ظاہر ہو جائے کہ اس کی کمزوریاں کیا ہیں اور خوبیاں کیا۔ چنانچہ امتحان لیا گیا اور جو بات کھلی وہ یہ تھی کہ یہ امیدوار تجرّیب و اطلاع کے اثر میں آکر پھسل جاتا ہے، اطاعت کے غم پر مضبوطی سے قائم نہیں رہتا، اور اس کے علم پر نسیان غالب آجاتا ہے۔ اس امتحان کے بعد آدم اور ان کی اولاد کو مستقل خلافت پر مامور کرنے کے بجائے آزمائشی خلافت دی گئی، اور آزمائش کے لیے ایک مدت (اجل مسمیٰ) جس کا ختم قیامت پر ہوگا، مقرر کر دی گئی۔ اس آزمائش کے دوران امیدواروں کے لیے معیشت کا سرکاری انتظام ختم کر دیا گیا۔ اپنی معاش کا انتظام انہیں خود ایزنا ہے۔ البتہ زمین اور اس کی مخلوقات پر ان کے اختیارات برقرار ہیں۔ آزمائش اس بات کی ہے کہ اختیار رکھنے کے باوجود یہ اطاعت کرتے ہیں یا نہیں، اور اگر قبول لاقی ہوتی ہے، یا تجرّیب و اطلاع کے اثر میں آکر یہ چھتے ہیں تو تنبیہ

تذکیر اور تعلیم کا اثر قبول کر کے سمجھتے بھی ہیں یا نہیں، اور ان کا آخری فیصلہ کیا ہوتا ہے، طاعت کا یا مصیبت کا۔ اس آزمائشی خلافت کے دوران میں ہر ایک کے طرز عمل کا ریکارڈ محفوظ رہتا گا۔ اور یوم الحساب میں جو لوگ کامیاب نکلیں گے انہی کو پھر مستقل خلافت، اُس دائمی زندگی اور لازوال سلطنت کے ساتھ جس کا لاپنج دسے کہ شیطان نے حکم کی خلاف ورزی کرائی تھی، عطا کی جائے گی۔ اُس وقت یہ پوری زمین حنیت بنا دی جائے گی اور اس کے وارث خدا کے وہ صالح بندے ہوں گے جنہوں نے آزمائشی خلافت میں طاعت پر قائم رہ کر، یا بھول لائق ہونے کے بعد بالآخر طاعت کی طرف پلٹ کر اپنی اہلیت ثابت کر دی ہوگی۔ حنیت کی اس زندگی کو جو لوگ محض کھانے پینے اور ایندھنے کی زندگی سمجھتے ہیں ان کا خیال صحیح نہیں ہے۔ وہاں پیہم ترقی ہوگی بغیر اس کے کہ اس کے لیے کسی منزل کا خطرہ ہو۔ اور وہاں خلافتِ الہی کے عظیم الشان کام انسان انجام دے گا بغیر اس کے کہ اسے پھر کسی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے۔ مگر ان ترقیات اور ان خدمات کا تصور کرنا بھلا ہے اتنا ہی مشکل ہے جتنا ایک بچے کے لیے یہ تصور کرنا مشکل ہوتا ہے کہ بڑا ہو کر سب وہ شادی کرے گا تو ازدواجی زندگی کی کیفیات کیا ہوں گی۔ اسی لیے قرآن میں حنیت کی زندگی کے عرف انہی لفظوں کا ذکر کیا گیا ہے جن کا ہم اس دنیا کی لذتوں پر تکیا کر کے کچھ اندازہ کر سکتے ہیں۔

اس موقع پر یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ آدم و حوا کا قصہ جس طرح بائبل میں بیان ہوا ہے اسے بھی ایک نظر دیکھ لیا جائے۔ بائبل کا بیان ہے کہ ”خدا نے زمین کی مٹی سے انسان کو بنایا اور اس کے نتھنوں میں زندگی کا دم پھونکا تو انسان جیتی جان ہوا۔ اور خداوند خدا نے مشرق کی طرف عدن میں ایک باغ لگایا اور انسان کو جسے اُس نے بنایا تھا وہاں رکھا۔“ اور باغ کے بیچ میں حیات کا درخت اور نیک و بد کی پہچان کا درخت بھی لگایا۔“ اور خداوند خدا نے آدم کو حکم دیا اور کہا کہ تو باغ کے ہر درخت کا پھل بے روک ٹوک کھا سکتا ہے لیکن نیک و بد کی پہچان کے درخت کا کبھی نہ کھانا۔ کیونکہ جس روز تو نے اس میں سے کھایا تو مرا۔“ اور خداوند خدا اُس سپی سے جو اُس نے آدم میں سے نکالی تھی ایک عورت بنا کر اسے آدم کے پاس۔ ”یا“ اور آدم اور اس کی بیوی دونوں نکلے تھے اور شرماتے نہ تھے۔“ اور سانپ گل و شتی جانوروں سے جن کو خداوند خدا نے بنایا تھا، چالاک تھا اور اُس نے عورت سے کہا کیا واقعی خدا نے کہا ہے کہ باغ کے کسی درخت کا پھل تم کھانا ہے؟“ سانپ نے عورت سے کہا کہ تم ہرگز نہ روگے بلکہ خدا جانتا ہے کہ جس دن تم اُسے کھاؤ گے تمہاری آنکھیں سہل جائیں گی اور تم خدا کی مانند نیک و بد کے جاننے والے بن جاؤ گے۔“

مجھے اندھا کیوں اٹھایا؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا " ہاں، اسی طرح تو ہماری آیات کو، جبکہ وہ تیرے پاس آئی تھیں، تو نے بھلا دیا تھا۔ اسی طرح آج تو بھلا یا جا رہا ہے۔" اس طرح ہم حد سے

پنپانچ عورت نے اس کا پھل لے کر کھایا اور اپنے شوہر کو بھی کھلایا۔ تب دونوں کی آنکھیں کھل گئیں اور ان کو معلوم ہوا کہ وہ ننگے ہیں اور انہوں نے انجیر کے پتوں کو سی کر اپنے لیے ٹنگیاں بنا لیں۔ اور انہوں نے خداوند خدا کی آواز، جو ٹھنڈے وقت بانع میں پھرتا تھا، سنی اور آدم اور اس کی بیوی نے اپنے آپ کو خداوند خدا کے حضور سے بانع کے درختوں میں چھپایا۔ پھر خدا نے آدم کو پکارا کہ تو کہاں ہے۔ اس نے کہا کہ میں تیری آواز سن کر ڈرا اور چھپ گیا کیونکہ میں ننگا تھا۔ خدا نے کہا ارے، تجھ کو یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ تو ننگا ہے۔ ضرور تو نے اُس درخت کا پھل کھایا ہو گا جس سے میں نے منع کیا تھا۔ آدم نے کہا کہ مجھے حقانے اس کا پھل کھلایا، اور حوا نے کہا مجھے سانپ نے بہکایا تھا۔ اس پر خدا نے سانپ سے کہا "اس لیے کہ تو نے یہ کیا تو سب چہر پاویں اور نشتی جانوروں میں ملعون ٹھیرا۔ تو اپنے پیٹ کے بل چلیگا اور عمر بھر خاک چاٹے گا اور میں تیرے اور عورت کے درمیان اور تیری نسل اور عورت کی نسل کے درمیان عداوت ڈالوں گا۔ وہ تیرے سر کو کچلے گا اور تو اُس کی ایڑی پر کاٹے گا" اور عورت کو یہ سزا دی کہ "میں تیرے دردِ حمل کو بہت بڑھاؤنگا تو درد کے ساتھ بچہ جنے گی اور تیری رغبت اپنے شوہر کی طرف ہوگی اور وہ تجھ پر حکومت کرے گا" اور آدم کے بارے میں یہ فیصلہ صادر کیا کہ چونکہ تو نے اپنی بیوی کی بات مانی اور میرے حکم کے خلاف کیا، اس لیے زمین تیرے سبب سے لعنتی ہوئی، مشقت کے ساتھ تو اپنی عمر بھر اس کی پیراوار کھائے گا۔۔۔۔۔ تو اپنے منہ کے پینے کی روٹی کھائے گا۔ پھر خداوند نے آدم اور اس کی بیوی کے واسطے چمڑے کے کرتے بنا کر ان کو پہنائے۔ اور خداوند خدا نے کہا دیکھو انسان نیک و بد کی پہچان میں ہم میں سے ایک کی مانند ہو گیا۔ اب کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنا ہاتھ بڑھائے اور شیا کے درخت سے بھی کچھ لے کر کھائے اور ہمیشہ جتیار ہے۔ اس لیے خداوند خدا نے اُس کو بانع عدن سے باہر کر دیا۔

رپیدائش، باب ۲- آیات ۷-۲۵- باب ۳- آیات ۱-۲۳-

بائبل کے اس بیان اور قرآن کے بیان کو ذرا وہ لوگ بالمقابل رکھ کر دیکھیں جو یہ کہتے ہوئے نہیں ٹرہاتے کہ قرآن میں یہ قصے بنی اسرائیل سے نقل کر لیے گئے ہیں۔

مخلہ قیامت کے روز نئی زندگی کے آغاز سے لے کر جہنم میں داخل ہونے تک جو مختلف کیفیات بحرین پر

گزرنے والے اور اپنے رب کی آیات نہ ماننے والے کو (دنیا میں) بدلہ دیتے ہیں، اور آخرت کا عذاب زیادہ سخت اور زیادہ دیر پا ہے۔

پھر کیا ان لوگوں کو (تاریخ کے اس سبق سے) کوئی ہدایت نہ ملی کہ ان سے پہلے کتنی ہی قوموں کو

گزریں گی ان کو قرآن مجید میں مختلف مواقع پر جدا جدا بیان کیا گیا ہے۔ ایک کیفیت یہ ہے: لَقَدْ كُنْتُمْ فِي غَفْلَةٍ

مِنْ هَذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ، تو اس چیز سے غفلت میں پڑا ہوا تھا، اب

ہم نے تیرے آگے سے پردہ ہٹا دیا ہے، آج تیری نگاہ بڑی تیز ہے۔ یعنی تجھے خوب نظر آ رہا ہے (رق۔ رکوع ۶۲)

دوسری کیفیت یہ ہے اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِیَوْمٍ تَشْتَعِبُ فِيهِ الْاَبْصَارُ مُخْطِئِينَ مُقْنَبِي رُؤْسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ اَلِیْهِمْ

طَرْفُهُمْ وَاَنْتُمْ هُمْ هَؤُلَاءِ، اللہ تو انہیں ٹال رہا ہے اُس دن کے لیے جب حال یہ ہوگا کہ آنکھیں چٹکی چٹکی

رہ گئی ہیں، سر اٹھانے جھانگے چبھ رہے ہیں، نظریں اوپر جھکی ہیں اور دل میں کہ اڑے جاتے ہیں: (ابراہیم۔ رکوع ۶)

تیسری کیفیت یہ ہے وَنُخْرِجُ لَهُ يَوْمًا لِقِيْمَتَهُ كَيْتًا يَابِقْتُهُ مَشْهُورًا، اِقْتِرَادًا كَيْتًا يَابِقْتُهُ

الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِبْنِيَا، اور قیامت کے روز ہم اس کے لیے ایک نوشتہ نکالیں گے جسے وہ کھلی کتاب

پائے گا۔ پڑھ اپنا نامہ اعمال، آج اپنا حساب لگانے کے لیے تو خود ہی کافی ہے: (بنی اسرائیل۔ رکوع ۶)

اور انہی کیفیات میں سے ایک یہ بھی ہے جو آیت زیر بحث میں بیان ہوئی ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ خدا

کی قدرت سے یہ لوگ آخرت کے ہونا ک مناظر اور اپنی شامت اعمال کے نتائج کو خوب دیکھیں گے، لیکن

بس ان کی بینائی یہی کچھ دیکھنے کے لیے ہوگی۔ باقی دوسری چیزوں سے ان کا حال اُس اندھے کا سا ہوگا جسے اپنا

راستہ نظر نہ آتا ہو، جو نہ لاٹھی رکھتا ہو کہ ٹٹول کر چل سکے نہ کوئی اس کا ہاتھ پکڑ کے چلانے والا ہو، قدم قدم پر

ٹھوکریں کھا رہا ہو، اور اس کو کچھ نہ سوچتا ہو کہ کدھر جائے اور اپنی ضروریات کہاں سے پوری کرے۔ اسی

کیفیت کو ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے کہ جس طرح تو نے ہماری آیات کو جھلا دیا تھا اسی طرح آج تو جھلایا

جارہا ہے: یعنی آج کوئی پروانہ کی جائے گی کہ تو کہاں کہاں ٹھوکریں کھا کر گرتا ہے اور کسی کیسی محرومیاں برداشت

کر رہا ہے۔ کوئی تیرا ہاتھ نہ پکڑے گا، کوئی تیری حاجتیں پوری نہ کرے گا، اور تیری کچھ بھی خبر گیری نہ کی جائے گی۔

۱۳ اشارہ ہے اُس "تنگ نہنگی" کی طرف جو اللہ کے ذکر، یعنی اس کی کتاب اور اس کے پیچھے ہونے

ہم ہلاک کر چکے ہیں جن کی (برباد شدہ) بستیوں میں آج یہ چلتے پھرتے ہیں؟ درحقیقت اس میں <sup>للہ</sup> بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سلیم رکھنے والے ہیں۔  
 اگر تیرے رب کی طرف سے پہلے ایک بات طے نہ کر دی گئی ہوتی اور مہلت کی ایک مدت مقرر نہ کی جا چکی ہوتی تو ضرور ان کا بھی فیصلہ چکا دیا جاتا۔ پس آئے محمدؐ، جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں ان پر صبر کرو، اور اپنے رب کی حمد و ثنا کے ساتھ اس کی تسبیح کرو سورج نکلنے سے پہلے اور غروب ہونے سے پہلے، اور رات کے اوقات میں بھی تسبیح کرو اور دن کے کناروں پر بھی <sup>للہ</sup>۔

دیں نصیحت سے منہ موڑنے والوں کو دنیا میں بسر کرائی جاتی ہے۔

۹ اشارہ ہے اہل مکہ کی طرف جو اس وقت مخاطب تھے۔

۱۰ یعنی تاریخ کے اس سبق میں، آثارِ قدیمہ کے اس مشاہدے میں، نسلِ انسانی کے اس تجربے میں۔

۱۱ یعنی چونکہ اللہ تعالیٰ ان کو ابھی ہلاک نہیں کرنا چاہتا، اور ان کے لیے مہلت کی ایک مدت مقرر کر چکا ہے اس لیے اس کی دی ہوئی اس مہلت کے دوران میں یہ جو کچھ بھی تمہاری ساتھ کریں اس کو تمہیں برداشت کرنا ہو گا اور صبر کے ساتھ ان کی تمام تلخ و شیریں باتیں سنتے ہوئے اپنا فریضہ تبلیغ و تذکیر انجام دینا پڑے گا۔ اس تحمل و برداشت اور اس صبر کی طاقت تمہیں نماز سے ملے گی جس کو تمہیں ان اوقات میں پابندی کے ساتھ ادا کرنا چاہیے۔

۱۲ ”رب کی حمد و ثنا کے ساتھ اس کی تسبیح“ کرنے سے مراد نماز ہے، جیسا کہ آگے چل کر خود فرمایا ”وَاصْبِرْ“

۱۳ ”أَهْلَكَ بِالْعُلُوَّةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا“، اپنے اہل و عیال کو نماز کی تلقین کرو اور خود بھی اس کے پابند رہو۔

۱۴ نماز کے اوقات کی طرف یہاں بھی صاف اشارہ کر دیا گیا۔ سورج نکلنے سے پہلے فجر کی نماز۔ سورج غروب

ہونے سے پہلے عصر کی نماز۔ اور رات کے اوقات میں عشا اور تہجد کی نماز۔ رتبے دن کے کنارے، تو وہ تین

ہی ہو سکتے ہیں۔ ایک کنارہ صبح ہے، دوسرا کنارہ زوالِ آفتاب، اور تیسرا کنارہ شام۔ لہذا دن کے کناروں سے

مراد فجر، ظہر اور مغرب کی نماز ہی ہو سکتی ہے۔ مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ۶۳۶۔

شاید کہ تم راضی ہو جاؤ۔ اور نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھو و نہیوی زندگی کی اس شان و شوکت کو جو ہم نے ان میں سے مختلف قسم کے لوگوں کو دے رکھی ہے۔ وہ تو ہم نے انہیں آزمائش میں ڈالنے کے لیے دی ہے، اور تیرے رب کا دیا ہوا رزق حلال ہی بہتر اور پائندہ تر ہے۔ اپنے اہل و عیال کو نماز کی تلقین کرو اور خود بھی اس کے پابند رہو۔ ہم تم سے کوئی رزق نہیں چاہتے، رزق تو ہم ہی دے رہے ہیں۔ اور انجام کی

اللہ اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں اور غالباً دونوں ہی مراد ملی ہیں۔ ایک یہ کہ تم اپنی موجودہ حالت پر راضی ہو جاؤ جس میں اپنے مشن کی خاطر تمہیں طرح طرح کی ناگوار باتیں سہنی پڑ رہی ہیں، اور اللہ کے اس فیصلے پر راضی ہو جاؤ کہ تم پر ناحق ظلم اور زیادتیاں کرنے والوں کو ابھی سزا نہیں دی جائے گی، وہ داخلی سزا کو ساتے بھی رہیں گے اور زمین میں دندانے بھی پھریں گے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ تم ذرا یہ کام کر کے نو دیکھو، اس کا نتیجہ وہ کچھ سامنے آئے گا جس سے تمہارا دل خوش ہو جائے گا۔ یہ دوسرا مطلب قرآن میں متعدد مقامات پر مختلف طریقوں سے ادا کیا گیا ہے۔ مثلاً سورہ نبی المثل میں نماز کا حکم دینے کے بعد فرمایا عَسَىٰ اَنْ يَّعِيْشَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا، تو تم سے کہ تمہارا رب تمہیں مقام محمود پر پہنچا دے گا۔ در کوع ۱۹۔ اور سورہ ضحیٰ میں فرمایا زَلَّالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّكَ مِنَ الْاٰوَّلٰى وَ لَسَوْفَ لِيُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى، تمہارے لیے بعد کا دور یقیناً پہلے دور سے بہتر ہے، اور عنقریب تمہارا رب تمہیں اتنا کچھ دے گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے۔

اللہ رزق کا ترجمہ ہم نے "رزق حلال" کیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کہیں بھی حرام مال کو "رزق رب" سے تعبیر نہیں فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارا اور تمہارے ساتھی اہل ایمان کا یہ کام نہیں ہے کہ یہ نفاق و فجار ناجائز طریقوں سے دولت میسر آئیٹھ کر اپنی زندگی میں جو ظاہری چمک دکھ پیدا کر لیتے ہیں، اس کو رشک کی نگاہ سے دیکھو۔ یہ دولت اور یہ شان و شوکت تمہارے لیے برگز قابل رشک نہیں ہے۔ جو پاک رزق تم اپنی عننت سے کھاتے ہو وہ خواہ کتنا ہی تھوڑا ہو، استباز اور ایماندار آدمیوں کے لیے وہی بہتر ہے اور اسی میں وہ جھلائی ہے جو دنیا سے آخرت تک برقرار رہنے والی ہے۔

اللہ اپنی تمہارے ہاں بچے بھی اپنی تنگ دستی و دستہ حالی کے مقابلہ میں ان حرام خوروں کے عیش و عشرت کو دیکھ کر دل شکستہ نہ ہوں۔ ان کو تلقین کرو کہ نماز پڑھیں۔ یہ چیز ان کے زاویہ نظر کو بدل دے گی۔ ان کے معیار بقدر کو بدل دے گی۔

بھلائی تقویٰ ہی کے لیے ہے۔<sup>۱۵</sup>

وہ کہتے ہیں کہ یہ شخص اپنے رب کی طرف سے کوئی نشانی (معجزہ) کیوں نہیں لاتا۔ اور کیا ان کے پاس اگلے صحیفوں کی تمام تعلیمات کا بیان واضح نہیں آگیا؟ اگر ہم اُس کے آنے سے پہلے ان کو کسی عذاب سے ہلاک کر دیتے تو پھر یہی لوگ کہتے کہ اے ہمارے پروردگار، تو نے ہمارے پاس کوئی رسول کیوں نہ بھیجا کہ ذلیل و رسوا ہونے سے پہلے ہی ہم تیری آیات کی پیروی اختیار کر لیتے۔ اے محمد، ان سے کہو۔ ہر ایک انجام کار کے انتظار میں<sup>۱۶</sup> ہے، پس اب منتظر رہو، غمگین نہ رہو، غمگین نہیں معلوم ہو جائے گا کہ کون سیدھی راہ چلنے والے ہیں اور کون ہدایت یافتہ ہیں۔

ان کی توجہات کامرکز بدل دے گی۔ وہ پاک رزق پر صابر و فانی ہو جائیں گے اور اس بھلائی کو جو ایمان و تقویٰ سے حاصل ہوتی ہے اُس عیش پر ترجیح دینے لگیں گے جو فست و مجبور اور دنیا پرستی سے حاصل ہوتا ہے۔

ﷺ یعنی ہم نماز پڑھنے کے لیے تم سے اس لیے نہیں کہتے کہ اس سے ہمارا کوئی فائدہ ہے۔ فائدہ تمہارا اپنا ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ تم میں تقویٰ پیدا ہو گا جو دنیا اور آخرت دونوں ہی میں آخری اور مستقل کامیابی کا وسیلہ ہے۔

ﷺ یعنی کیا یہ کوئی کم معجزہ ہے کہ انہی میں سے ایک اتنی شخص نے وہ کتاب پیش کی ہے جس میں شروع سے اب تک کی تمام کتب آسمانی کے مضامین اور تعلیمات کا عطر نکال کر رکھ دیا گیا ہے۔ انسان کی ہدایت و رہنمائی کے لیے اُن کتابوں میں جو کچھ تھا، وہ سب نہ صرف یہ کہ اس میں جمع کر دیا گیا، بلکہ اس کو ایسا کھول کر واضح بھی کر دیا گیا کہ صحرا نشین بدو تک اس کو سمجھ کر فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

ﷺ یعنی سب سے یہ دعوت تمہارے شہر میں اُٹھی ہے، نہ صرف اس شہر کا بلکہ گرد و پیش کے علاقے کا بھی ہر شخص انتظار کر رہا ہے کہ اس کا انجام آخر کار کیا ہوتا ہے۔